

لہو اور قالین

میرزا ادیب

مقبول اکیڈمی

۱۹۹۔ سرکلر روڈ۔ چوک انارکلی لاہور

اہتمام ——— ملک مقبول احمد
مطبع ——— مرشد پرنٹرز لاہور
قیمت ——— ساٹھ روپے

مقبول اکیڈمی، لاہور

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

(مصحفی)

ترتیب

ڈاکٹر محمد حسن

سرِ آغاز

ڈرامے کی جذباتی تقسیم کے سلسلے میں سب سے زیادہ نمایاں اصول سنسکرت ڈرامے نے مرتب کیے ہیں جس طرح ہندوستانی موسیقی آٹھ بنیادی جذبے پیدا کرنے کے لئے مخصوص کردی گئی ہے اسی طرح آٹھ "رس" کی تقسیم نے سنسکرت ڈرامے کے ان اثرات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے جو دیکھنے والوں پر مرتب ہو سکتے ہیں۔ ان میں رومان، فرحت، غم، غصہ، خوف، حوصلہ، نفرت اور حیرت شامل ہیں۔ اس تقسیم سے کسی حد تک کلاسیکی ذہن کی کارفرمائی کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے کی ابتداء بہت بعد میں ہوئی۔ لیکن جب تک اس کی اصل اور ماضی کی روایات کا کوئی اندازہ نہ ہو ایک ایکٹ کے ڈرامے کی معنویت تک پہنچنا دشوار ہے۔

اس سے پہلے کہ ایک ایکٹ کے ڈرامے کی اپنی تکنیک پر غور کیا جائے عہدِ جدید کے ڈرامائی رجحانات پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ یہاں میں ڈرامے کی ان عظیم روایات کا تذکرہ نہیں کروں گا جو ہر ایک قاری کے ذہن میں واضح ہوں گی۔ مثلاً شیکسپیئر نے انگلستان اور یورپ کے اسٹیج سے جس طرح اپنے ڈراموں کی نوعیت تراشی اور اس کے ڈراموں میں جس طرح کلاسیکیت اور رومانیت کا حسین امتزاج ملتا ہے آج اس کی طرف توجہ دلانا تحصیلِ حاصل ہے۔

جدید ذہن پر سب سے گہرا اثر ابسنؔ، چیخوفؔ اور برنارڈ شا کے ڈراموں کا ہے ابسنؔ کے بارے میں عام طور پر کہا گیا ہے کہ اس کا کام سوال پوچھنا ہے جواب دینا نہیں ہے۔ لیکن اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ ابسنؔ اپنے ڈرامے کا کینوس کائنات اور حیات کے مسائل تک پھیلا دیتا ہے۔ اور ان وسیع، ہمہ گیر اور اہم انسانی مسائل کو نہایت گھریلو اور عام پس منظر میں پیش کرتا ہے۔ اس نے کلاسیکی ڈرامے کی شان و شوکت، آرائشِ بیان اور غیر معمولی پس منظر کی قیود کو پسِ پشت ڈال کر سماجی مسائل کے تجزیے کو اپنایا ہے۔

چیخوفؔ نے سادگی اور پُرکاری سے دنیا کو چونکا دیا۔ اس کے ڈرامے زندگی کے نعم البدل ہیں، وہ چونکا دینے والے عدمے یا محنت سے تیار کیے ہوئے نقطۂ عروج کی بجائے روزمرّہ کی زندگی کے کردار اور واقعات اسٹیج پر لاتا ہے اور انہیں اسی طرح باتیں کرنے اور عمل کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیتا ہے جیسے وہ حقیقی زندگی میں کرتے ہوں گے۔ ان کی باتوں، ان کے حرکات و سکنات اور ان کی خوبصورت بے تکلفی سے مجموعی تاثر پیش کرتا ہے۔ اس کے یہاں مسائل مکالمے کے لطائف بن کر آتے ہیں اور اگر دیکھنے والا ذہین اور حساس نہ ہو تو شاید وہ نسیم صبح گاہی کے جھونکے کی طرح اس کے سر کے اوپر سے گزر جائیں۔ اسی لئے اس کے ڈرامے اسٹیج کے لئے خاص پر دشوار ہیں۔

اس کے بعد برنارڈ شا ہے جو بقول شخصے عمر بھر لوگوں کی توجہ منعطف کرنے کے لئے چوراہے پر سر کے بل کھڑا رہا ہے اور اس نے اپنے ڈرامے کو مذہبی عبادت

کی بجائے عمرانی زندگی کی تشخیص کے لئے استعمال کیا۔ شا چونکا دینے والے کرداروں اور سنسنی خیز واقعات کا فن کار ہے اور اس کے عمرانی ڈراموں نے زندگی کی جھوٹی ملمع کاری اور منافقانہ حماقت کو بے نقاب کرنے کا معجزہ سرانجام دیا ہے۔

آج کے ڈرامہ نگار کے سامنے روایت کے یہ ذخیرے بکھرے ہوئے ہیں۔ خود آج کے دور میں بھی اچھی خاصی تعداد میں تجربے ہو رہے ہیں۔ ٹی، ایس، ایلیٹ کے منظوم ڈرامے اور سارترے کے نثری ڈرامے اہمیت حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر ملک میں اسٹیج کی تحریک جاگنے لگی ہے اور اب اس سے عمرانی شعور کو بیدار کرنے کا کام لیا جا رہا ہے اسٹیج کی نوعیت میں بھی انقلابی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ ایک طرف متحرک اسٹیج ہے جس میں بڑی معمولی میکانکی کوشش کے بعد سین اور سیٹ تبدیل کیئے جا سکتے ہیں دوسری طرف کھلی ہوا میں ڈرامہ کھیلنے والی منڈلیاں ہیں۔

اسی لحاظ سے ہمارے ڈراموں کی ہیئت اور تکنیک میں بھی نت نئے تجربوں کی گنجائش پیدا ہو گئی ہے اور اسی حساب سے اس کی ذمہ داریاں کافی بڑھ گئی ہیں جہاں سینما، ٹیلی ویژن اور ریڈیو نے اس کا بار ہلکا کر دیا ہے وہاں کم از کم انگلستان اور براڈوے میں اس کے شائقین کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ لوگ میکانکی طریقوں کی جگہ زندگی کی زیادہ حقیقی تصویر دیکھنے کے آرزومند ہیں اور چونکہ یہ فن تمام فنونِ لطیفہ کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے اس لئے اس کی اپیل دوسری اصناف سے کئی گنا زیادہ ہے۔

بدقسمتی سے ہندوستان میں تھیئٹر کی خاطر خواہ ترقی نہیں ہوئی۔ ہماری روایات بھی اس سلسلے میں بہت زیادہ مرعوب کن نہیں ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ نے ٹھیک کہا ہے:

"تھیئٹر ایک ایسا عطیہ ہے جو ہر قوم کو نہیں ملتا خواہ اس کا تمدن کتنا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو۔ یہ عطیہ مختلف اوقات میں ہندیوں، جاپانیوں،

یونانیوں، انگریزوں، فرانسیسیوں اور ہسپانیوں کو ملا۔"

اس محرومی میں عہدِ قدیم کے ہندوستان کو چھوڑ کر ہمارا برِصغیر بھی شامل ہے۔ اس میں بہت کچھ قصور ہندوستان میں آنے والی قوموں اور خصوصاً مسلمانوں کا ہے۔ عرب ڈرامے سے محروم رہے اور اسلام نے موسیقی کے ساتھ اسے بھی لہو ولعب ہی میں شامل رکھا اور اپنے ساتھ ایران، ترکی اور اس کے بعد ہندوستان کی ادبیات، خصوصاً اردو کو بھی ڈرامے کی صنعت میں کمال پیدا نہ کرنے دیا۔

یہ موقع نہیں کہ اپنی محرومی کے اسباب پر تفصیلی نظر ڈالی جائے۔ یہ احساس البتہ کافی تسکین بخش ہے کہ بایں ہمہ ہمارا دامن گراں مایہ جواہر پاروں سے خالی نہیں ہے۔ سنسکرت ادبیات نے ڈرامے کو ممتاز جگہ بخشی اور تہذیب کے ابتدائی دور میں "بھارتیہ ناٹیہ شاستر" کی تصنیف بتاتی ہے کہ ہندوستان میں یہ فن کتنا قدیم ہے۔ سنسکرت ڈرامے نے جذباتی تاثر کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک وہ تاثر جو ڈرامہ دیکھنے والوں میں پیدا کرتا ہے اور دوسرا وہ تاثر جو اداکار تاثر پیدا کرنے کے لئے خود پر طاری کرتا ہے ان میں گویا دوسری شق کے تاثرات سبب ہیں اور پہلی شق کے تاثرات نتیجہ۔ پہلی قسم بھاؤ کہلائی اور دوسری رس۔ حالانکہ یونانی ڈرامے کی طرح سنسکرت ڈرامے نے کبھی صرف ایک تاثر یا بھاؤ پر اصرار نہیں کیا اور مختلف قسم کے تاثرات اور جذبات سے اپنے فن پارے تیار کیئے۔

یونانی اور سنسکرت ڈرامے کا تقابل مناسب نہ ہوگا۔ لیکن اگر ان دونوں کے مابہ الامتیاز اجزاء کو نمایاں کرنے کے لئے انہیں ایک دوسرے کے سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو کچھ بنیادی خصوصیات تک رسائی ہو سکتی ہے۔ سنسکرت ڈرامہ یونانی ڈرامے کے برعکس وحدتِ ثلاثہ کو نظر انداز کرتا ہے۔ یونانی ڈراموں کی سب سے بڑی خصوصیت کورس سے سنسکرت کے ڈرامے ناآشنا ہیں۔ اور وحدتِ تاثر کی بجائے وہ مختلف جذبات کی رنگارنگی کو ہم آہنگ کرتے ہیں۔

یونانی ڈرامے میں انسان فطرت اور مشیت سے برسرِ پیکار نظر آتا ہے سنسکرت ڈرامے

میں انسان نہایت مطیع اور فطرت سے ہم آہنگ ہے اسی لئے سنسکرت ڈراموں میں فطرت کو جس قدر دلکش اور سادہ روپ میں پیش کیا گیا ہے وہ شاید کسی اور جگہ ممکن نہ تھا یہی وجہ ہے کہ سنسکرت ڈراموں میں کرداروں کا کوئی شمار نہیں اور چونکہ یہ کردار یونانی اسٹیج کے برعکس نہ تو نقاب پہنتے ہیں اور نہ آرائش اور بناوٹ کے دوسرے ذرائع استعمال کرتے ہیں لہٰذا ان کرداروں کو کسی بھی تعداد میں عام ناظرین ہی میں سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہاں عورتوں کے پارٹ خود عورتیں ہی ادا کرتی ہیں۔ مختلف طبقے کے کردار مختلف قسم کی زبان استعمال کرتے ہیں اور اسٹیج کسی آرائش اور آراستہ سٹینگ سے تقریباً محروم ہے۔ یہاں اسٹیج کے چاروں طرف ہر طبقے اور ذات پات کے بیٹھنے والوں کے الگ الگ رنگ کے ستون اور حلقے بنے ہوئے ہیں اور اسٹیج اس طرح وسط میں ہے کہ سب لوگوں تک آواز پہنچ سکے۔

ہندو فلسفۂ حیات کے نزدیک فطرت اور انسان کی کشمکش کا تصور ہی محال تھا۔ اس لئے المیہ کا تصور سنسکرت ڈرامے میں بالکل ناپید ہے۔ کرم کے فلسفے نے اس اعتقاد کو جنم دیا کہ نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی اور اگر اس کا پھل اس جنم میں نہ ملے تو اگلے جنم میں ضرور ملتا ہے۔ جنم اور آواگون کے فلسفے نے اس دور کی ادبی تنقید کو اس درجہ متاثر کیا ہے کہ مفکرین نے ادبی مذاق اور مسرت کی تعریف ہی اسی کی مدد سے کی ہے۔ ادب کا منتہیٰ صرف یہ ہے کہ وہ وحدت کا تاثر پیدا کر سکے اور اس وحدت کے تاثر سے حظ لینے کے لئے اور اس کی تخلیق کے لئے ایسے جمالیاتی اور جذباتی تجربوں کی ضرورت ہے جو انسان کو پیش آ چکے ہوں۔ جب تک کسی کو پچھلے جنم میں یہ تجربے پیش نہ آئے ہوں اس وقت تک اس کا مذاقِ سلیم اور اس کی تخلیق میں جمالیاتی وحدت کا تاثر نہیں مل سکتا۔

چلتے چلتے سنسکرت ڈرامے کی ایک برگزیدہ شخصیت سے اور ملاقات کرتے چلیں۔ یہ ویدوشک یا بدوشک کا کردار ہے جس سے یونانی ڈرامہ قطعی ناآشنا ہے۔

خود اردو ڈرامے میں یہ روایت کافی عرصہ تک چلتی رہی اور اسٹیج سے آگے بڑھ کر فلم تک میں دو ایک ایسے کردار ضرور ملتے ہیں جن کا اصل کہانی سے وہ گہرا ربط نہیں ہے مگر وہ ہنسنے ہنسانے کے لئے پیش کئے گئے ہیں۔

اوراقِ پارینہ کی اس ورق گردانی سے اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بھرت کی "ناٹیہ شاستر" کے علاوہ بھی ہماری ڈرامائی روایات میں بہت کچھ ذخیرے موجود ہیں گو ان کا سلسلہ ایک عرصے تک تقریباً منقطع رہا۔ اب یہاں ان عوامی بیلاڈں، ناٹک منڈلیوں اور کتھا کلی رقص کی بات چھوڑیئے جو اس روایت کو کسی نہ کسی طرح چلاتی رہتی ہیں، واجد علی شاہ کے دور تک رہس منڈلیوں اور ناٹک منڈلیوں کی روایت چلتی رہتی ہے پھر اندر سبھا سے ادب اور اسٹیج کے رشتے ایک بار پھر ملتے ہیں اور اردو میں ڈرامائی ادب پھر سے رونما ہونے لگتا ہے۔

عہد جدید میں آئیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسٹیج پارسی منیجروں کے ہاتھ میں پڑ کر صرف تفریح طبع کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔ بے تاب، طالب بنارسی، احسن اور آغا حشر کاشمیری نے دراصل اردو ڈرامے کو قبولیتِ عام اور ادبیت کا درمیانی رابطہ بنانے کی کوشش کی۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود اردو ڈرامہ فکری اعتبار سے بہت کچھ تہی دامن رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آغا حشر نے اردو ڈرامہ نگاری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ادبی زبان، ڈرامے کی فضا اور کرداروں کی آویزش کی بلند آہنگی ان کے ڈراموں کی خصوصیات ہیں۔ لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود آغا حشر اردو ڈراموں کو فکری سنجیدگی اور صلابت نہیں بخش سکے۔ ڈرامے کے پاس احساس اور جذبہ کی فراوانی تو تھی لیکن ذہن نہ تھا۔

اردو ڈرامہ ہنوز اپنے غالب یا اقبال کی آمد کا منتظر ہے۔

کم و بیش اس فضا میں ہندوستان میں فلم اور ریڈیو کی آمد آمد ہوئی۔ فلم نے پہلے پہل اسٹیج ہی کی روش کو اپنایا۔ جب تک پردۂ سیمیں پر خاموشی کا دور دورہ رہا صرف میلوڈرامائی حرکات و سکنات سے کام لیا جاتا رہا اور جب الفاظ اور آواز بھی سینما کے پردے

میں شامل ہوگئی تو بھی عرصے تک ہندوستانی فلم تھیٹر اور وہ بھی وکٹورین عہد کے تھیٹر کی پیروی کرتا رہا۔

ریڈیائی ڈرامے کی بھی بہت کچھ یہی خامی رہی ہے لیکن اس خامی کے باوجود اپنی نمایاں خصوصیات اور تقاضوں کی بناء پر ریڈیائی ڈرامہ تھیٹر کے روائتی رنگ کو ایک نیا رُخ دینے میں کامیاب ہوا۔ باوجود اس کے کہ اس دور میں امتیاز علی تاج کا ڈرامہ "انار کلی"، عابد حسین کا "پردۂ غفلت" اور محمد مجیب کا "حبہ خانم" لکھے گئے یہ دور یک بابی ریڈیو ڈراموں کا دور کہلائے گا۔

آسانی کے لئے اس ترکیب میں سے "ریڈیائی" کا لفظ نکال دیجئے۔ کیونکہ جن ڈراموں کے لئے میں یہ چند الفاظ لکھ رہا ہوں وہ التزاماً ریڈیو کے لئے نہیں لکھے گئے ہیں۔ یہاں یک بابی ڈراموں پر چند باتیں ذہن میں رکھنا ضروری ہیں۔

یہ باتیں کم و بیش وہی ہیں جنہیں میں نے صرف یہ سمجھ کر دہرانے سے گریز کیا ہے کہ ہر ایک ڈرامہ نگار اور ڈرامے کا ہر ایک ذہین طالب علم انہیں اچھی طرح جانتا ہے۔ ان میں سب سے پہلے تاثر کا سوال ہے، میں یہاں وحدتِ تاثر اور وحدتِ عمل کی اصولی بحث نہ اٹھاؤں گا لیکن اتنی بات واضح ہے کہ یک بابی کا کینوس چونکہ مکمل ڈرامے سے بہت مختصر ہوتا ہے اس لئے اس کا مرکزی نقطۂ خیال بہت سمٹ کر اور بہت زیادہ یک سوئی کے ساتھ آنا ضروری ہے۔

یہ تاثر کیا ہو اور کیسے پیش کیا جائے؟ اس کے بارے میں فیصلہ کن نتائج پر پہنچنا بہت مشکل ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یک بابی ڈرامے کی عظمت اور کامیابی کا دارومدار صرف اس بات پر منحصر ہے کہ اس کا بنیادی تاثر کیا ہے اور اسے کس انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

یہ تاثر دراصل ڈرامہ نگار اور مصنف کے زاویۂ حیات سے پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے پیش کرنے میں سب سے بڑی قباحت یہی ہے کہ اسے ڈرامہ نگار کی ذاتی رائے

یا نجی فلسفۂ حیات کی طرح پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ڈرامہ نگار خود پسِ پردہ بازی گر کی طرح مختلف کرداروں کو اسٹیج پر چلتا پھرتا ہوا دکھاتا ہے۔ انہیں ان کی اپنی شخصیت، ان کی اپنی زبان اور لہجہ، ان کے اپنے واقعات اور حرکات و سکنات بخشتا ہے اور ان کے الفاظ اور مکالموں کی آویزش سے اپنا مافی الضمیر دیکھنے والوں کے دل و دماغ پر مرتسم کرتا ہے۔ اسی فن کو میتر لنک نے "بلیغ خاموشی" کہا ہے۔ مثال کے طور پر دو ڈرامہ نگاروں کی گواہی خود ان کی نگارشات کے بارے میں دیکھئے۔ البسن نے اپنے ڈرامے "گڑیا کا گھر" کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"میں اس ڈرامے کے ذریعے اس فرق کو واضح کرنا چاہتا تھا جو زندگی کی طرف مرد اور عورت کے زاویۂ نظر میں ہوتا ہے۔ عورت محبت اور فرض کا تقاضا سمجھ کر اور اسے ایک معمولی فرض سمجھ کر ایک ایسی حرکت بھی کر سکتی ہے جو اس کے شوہر کے نزدیک گناہِ کبیرہ ہو جائے اور اس محبت اور فرض کے رشتے ہی کو ختم کر دے۔"

دوسری گواہی خود "لہو اور قالین" کے مصنف کی ہے:

"دوسرے منظر میں ایک گم کردہ راہ بچہ دکھائی دیتا ہے جو مکتب اور گھر — دونوں سے کوسوں دور ایک ویران سی جگہ پر کھڑا آنسو بہا رہا ہے۔ ایک شخص ادھر سے گزرتا ہے اور اسے اپنے گھر لے جاتا ہے سردی عالمِ شباب پر ہے۔ بچے کے دانت سے دانت بج رہے ہیں۔ وہ شخص اسے ایک نہایت نرم بستر میں لٹا دیتا ہے اور اس کے نحیف و نزار جسم کو رضائی میں چھپا دیتا ہے۔ اسی اثناء میں اس شخص کی بیوی بسکٹ وغیرہ لے کر آ جاتی ہے۔ بچہ آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے۔ چار نہایت مہربان آنکھیں بڑے مشفقانہ انداز میں اسے دیکھ رہی ہیں۔"

اس منظر سے ذرا اس مجموعے کے تین ڈراموں کو مطابق کر کے دیکھئے۔ بچہ گاڑی،

بہن اور سمندر کا دل۔ یہاں میں ان ڈراموں کا تفصیلی جائزہ لینے کی کوشش نہ کروں گا۔ لیکن اس بات کی طرف ضرور اشارہ کروں گا کہ ڈرامے کا بنیادی تاثر رمز اور مکالمات، کرداروں اور واقعات کی آویزش سے مرتب ہوتا ہے وہ بلاواسطہ تقریر اور خطابت سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

اب اس تاثر کی نوعیت پر غور کیجئے۔ آیا یہ تاثر صرف احساس اور جذباتی ردِ عمل ہو یا یہ محض ابسن کی طرح مشکل اور کسی حد تک پریشان کن سوالات ہی پوچھنے پر اکتفا کرے یا کائنات اور اس کی الجھنوں کا جواب دینے کی کوشش کرے۔ یہ بات بہت کچھ خود ڈرامہ نگار کی فکری پختگی پر منحصر ہے۔ ہر حالت میں اس کا نقطۂ نظر اس کے افسانوں کے زاویوں، اس کے کرداروں اور اس کے ڈراموں کی تشکیل میں جھلکے گا، اور جس قدر اعتماد اور تجزیاتی نظر کے ساتھ وہ جذبہ اور ادراک، احساس اور فکر کو یکجا کر سکے گا اسی قدر اس کے ڈرامے عظمت سے قریب تر ہوں گے۔

یک بابی ڈرامے کی پہلی حد بندی یہی ہے کہ اس کے مرکزی خیال کو حد سے زیادہ سادہ، مربوط اور مکمل ہونا چاہیئے۔ اس کی تعمیر میں ایک واقعہ، ایک مکالمہ اور ایک غیر ضروری کردار کی موجودگی صحیح مقام سے توجہ کو ہٹانے کا موجب ہو سکتی ہے۔

یک بابی، ہونے کی وجہ سے ڈرامہ نگار کے پاس بہت ہی محدود وقت ہوتا ہے، اور اس مختصر سے وقفے میں اسے زندگی کا ایک اطمینان بخش اور نمائندہ زاویہ پیش کرنا ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں اس کے ہاں واقعات کا انتخاب بے حد احتیاط اور توجہ سے ہونا چاہیئے۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے ایک خاص قسم کے واقعات ہی کو ڈرامے کے لئے موزوں کہا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ واقعات اور ڈرامے کی افسانویت پر کردار نگاری کو مکالموں اور تاثر سے بھی زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ کردار نگاری اور بنیادی تاثر کا پلڑا بھاری ہوتا گیا اور اب پلاٹ میں ریاضی کے سے ربط اور آہنگ کی بجائے اس کے حقیقی زندگی سے

قرب پر زور دیا جانے لگا۔

آج بھی کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو فن کار کے لئے چند خاص موضوعات منتخب کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ نادان دوست دراصل ادبی تخلیق کے عمل کو میکانکی بنا کر اس کی توہین کرتے ہیں۔ انہیں فن کار کی اس نظر کا عرفان حاصل نہیں جو قطرے میں دجلہ اور جزو میں کل کا دیدار کرتی ہے۔ یہاں میں میترلنک کا ایک طویل اقتباس پیش کرنے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن اس کی خوبصورتی، استدلال اور اہمیت اس کی مستحق تھی کہ اسے پورا ہی نقل کیا جائے۔

مجھے اب یہ یقین ہو چلا ہے کہ ایک بوڑھا آدمی زیادہ حقیقی زندگی گذار رہا ہے — جو اپنی آرام کرسی پر بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔ اس کا لیمپ اس کے برابر رکھا ہوا ہے۔ اور وہ غیر شعوری طور پر ان تمام ابدی قوانین کی طرف کان لگائے ہوئے ہے جو اس کے مکان پر حکمران ہیں۔ جو انہیں سمجھے بغیر ان کی تفسیر کرتا ہے اور دروازوں اور دریچوں کی خاموشی کی لرزتی ہوئی آواز کی تفسیر کرتا ہے اور خاموشی سے اپنی روح اور اس کی ناگزیر مقدر روشنی کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔

ایک ایسا بوڑھا انسان جو سوچتا ہے کہ دنیا کی ساری طاقتیں گھر کے بہت سے ملازمین کی طرح ہیں جو ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں اور کمرہ کی نگرانی کرتے ہیں، جو اس بات کا گمان رکھتا ہے کہ جس میز سے وہ سہارا لگائے بیٹھا ہے اسے خود سورج خلاء میں روکے ہوئے ہے یا آسمان کا ہر ایک ستارہ اور اس کے جسم کا ہر ریشہ پلک جھپکنے یا ہر خیال کی پیدائش سے براہِ راست متعلق ہے۔

یقین ہو چلا ہے کہ ایسا بے حس و حرکت بوڑھا آدمی بہرحال ایک حقیقی، کہیں زیادہ گہری، زیادہ انسانی اور زیادہ کائناتی زندگی گزار رہا

ہے، بہ نسبت اس عاشق کے جو اپنی محبوبہ کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ یا بہ نسبت اس کپتان کے جو جنگِ عظیم سے فتح مند ہو کر واپس آتا ہے"۔

میٹرلنک کا یہ احساس محض شاعرانہ خیال نہیں ہے۔ ایک فلسفیانہ حقیقت ہے۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی بات میں بنیادی مسائل کا عکس ملتا ہے۔ عظیم فن کار وہی ہے۔ جو اس گہرے معنوی تاثر تک پہنچ سکے۔

آج جبکہ واقعات اور ان کی تخصیص سے توجہ ہٹتی جا رہی ہے۔ میلوڈرامائیت، طوفانی آویزش اور روائتی نقطۂ عروج کی تلاش پر اتنا زور نہیں دیا جاتا۔ چیخوف کی روایت زیادہ پر اثر اور عام ہوتی جا رہی ہے۔ چیخوف کے نمائندہ ڈراموں میں "شیری آرچرڈ" اور "تین بہنیں" کا نام لیا جا سکتا ہے اور ان میں کلاسیکی یا نیم کلاسیکی انداز میں پلاٹ ڈھالنے اور نقطۂ عروج کی میلوڈرامائی آویزش پیش کرنے کی بجائے چیخوف نے اسے حتی الامکان عام اور حقیقی بنانے پر زور دیا ہے۔

اس روایت کا سب سے بڑا اجادو اس کی حقیقی فضا ہے جو چونکا دینے والے واقعات اور کرداروں سے خالی ہے مگر جن میں سے ہر ایک پر ہماری حقیقی زندگی کے واقعات اور کرداروں کا شبہ ہوتا ہے۔ زیر نظر ڈراموں میں سے اکثر میلوڈرامائی کشمکش سے خالی ہیں۔ ان میں محض مسائل کو بیان کرنے کا حوصلہ ملتا ہے اور وہ بھی بڑے خاموش اور متین لہجے میں، یہاں نو کلاسیکی انداز کا کلائمکس تقریباً مفقود ہے۔

"تقریباً" کا لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے کیونکہ میرا ادیب کہیں کہیں قدیم اردو ڈرامے کی روایت سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ یہاں میں خاص طور پر "مسافر" کے اختتامیہ ٹکڑوں کی طرف توجہ دلاؤں گا جو بالکل قدیم اردو ڈراموں کی طرح ناقابلِ یقین واردات پر ختم ہوتا ہے۔

اس کے مقابلے میں "بہن"، "سمندر کا دل" اور "بچہ گاڑی" میں زندگی کی حقیقی جھلک پیش کر کے اس سے تاثر پیدا کرنے کی کوشش نمایاں طور پر ملتی ہے۔ "بہن" میں کوئی غیر

معمولی اور میلوڈرامائی کلائمکس نہیں ہے۔ بات صرف ایک مریضہ کے احساسِ تنہائی کی ہے۔ لیکن دراصل یہ احساسِ تنہائی محض اس مریضہ کا نہیں آج کے مشینی دور کے سارے افراد کا ہے۔ آج جبکہ شہروں کی ہماہمی اور دفتری اور صنعتی زندگی نے خاندان اور سماج کی چھوٹی چھوٹی عمرانی وحدتوں کو شکست کر دیا ہے۔ فرد اپنے کو خلاء میں محسوس کر رہا ہے۔ انسان کی حیثیت سے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اس کی دلجوئی کرنے والا اور اس سے جذباتی وابستگی قائم کرنے والا کوئی نہیں ہے خون کے سارے رشتے روپے کے رشتوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ دو گھڑی اپنی کہنے اور دوسرے کی سننے کا وقت کسی کے پاس نہیں ہے۔ ایسے عالم میں ہم سب ہی اس مریضہ کی طرح تنہا ہیں۔ چیخوف کے کردار کے لفظوں میں "ہماری روحیں بے حد قیمتی پیانو کی طرح ہیں۔ جس کی کنجی گم ہو گئی ہے۔"

میرزا کے موضوعات کی یہ ایک خصوصیت ہے، ان میں ہمہ گیری، گہرائی اور سماجی معنویت ہوتی ہے۔ لیکن وہ بظاہر بے حد معصوم، نرم و نازک اور معمولی مسئلے معلوم ہوتے ہیں۔ "سمندر کا دل" میں شاید یہ کوشش اور بھی زیادہ نمایاں ہے، یہاں گویا ڈرامہ نگار انسانی فطرت کے ایک اہم گوشے سے نقاب اٹھاتا ہے۔ غم و الم کا انسانی زندگی میں کیا مقام ہے؟ یا یوں کہئے کہ یونانی ڈرامے نے انسان اور مشیت کی جس کشمکش کو پیش کیا تھا یہ اس کی داخلی تصویر ہے، یہ ہمیں المیئے کے ہیرو کی شکل و صورت اور اس کی ناکامی نہیں دکھاتی بلکہ اس کے دل کی پہنائیوں میں لے جاتی ہے۔

"سمندر کا دل" اس طرح شروع ہوتا ہے:

حناں: توبہ خالص دودھ آبِ حیات ہو گیا ہے آج کل۔

رکھی: پر اتنا دودھ کرنا کیا ہے؟ ڈیڑھ سیر تو پہلے ہی گھر میں ہے۔ کیا ہوا اور پوتے کو دودھ میں نہلانے کا ارادہ ہے تمہارا؟

حسناں :۔ تمہیں کیا خبر رکھو! زچہ روٹی ووٹی تو زیادہ کھاتی نہیں دودھ ہی پر جیتی ہے۔
اور پھر اسے بچے کو بھی دودھ پلانا ہوتا ہے ۔

رکھی : (طنزاً) جی ہاں! مجھے کیا خبر ہوگی۔ یہ سات پوتے پوتیاں تو آسمان سے گرے
ہیں نا!"

یہاں دیکھنے والوں کی پوری توجہ ابتداء کے چار جملوں سے کلائمکس کی طرف مرکوز ہو جاتی ہے۔ بہو اور پوتے کی آمد حسناں کے نزدیک کس قدر اہمیت رکھتی ہے، کتنی محبت، اشتیاق اور حسرت کے ساتھ وہ ان لوگوں کے آنے کا اہتمام کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ انسان کس طرح چھوٹی چھوٹی مسرتوں سے خود کو تسکین دیتا ہے، اور جب عالمِ خیال کے موتیوں سے بنائے ہوئے یہ قصرِ شیریں بھی ٹوٹ جاتے ہیں، تو بھی رو دھو کر، پھر سے دوسرا قصر بنانے میں لگ جاتا ہے۔

حسناں اور رکھی کے کردار کو کسی حد تک نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ رکھی ایک نارمل قسم کی عورت ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :۔

"ایک دبلی پتلی عورت ہے، سر کے بال پک چکے ہیں۔ حسناں کی گہری سہیلی ہے اور اس کے بے جا اہتمام اور وہم کو پسند نہیں ملتی اور اس کا لہجہ اکثر جگہ شوخ اور جوانوں کا سا ہو جاتا ہے۔

حسناں "رکھی سے کم عمر ہے صحت رکھی سے بھی خراب ہے۔" آگے رکھی کی زبانی اس کے بارے میں یہ گواہی ملتی ہے کہ اس کا بیٹا مر چکا ہے اور وہ ساری محبت اور شفقت پوتے پر مرکوز کئے بیٹھی ہے پھر اس قسم کے دو چار نرم و نازک مکالمے حسناں کے کردار کو واضح کرتے ہیں :۔

رکھی : اتنی ساری مٹھائی کاہے کو منگوالی ہے؟

حسناں : میں نے سوچا بہو اور بیٹے کو دیکھنے کے لئے ہمسائیاں آئیں گی، بچے آئیں گے
ان کے لئے کچھ منگوا رکھوں۔"

ابتدائی حصے میں اسٹیج پر کوئی واقعہ نہیں ہوتا۔ حرکت کے اعتبار سے صرف کبھی کبھی حساں دودھ کی دیگچی اٹھا کر لاتی اور لے جاتی ہے۔ کبھی دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہے۔ کبھی پلنگ کے نیچے سے نیلے رنگ کا ٹرنک نکالتی ہے ظاہر ہے کہ اس "سست رفتاری" کا ایک خاص مقصد ہے۔ ایک تو اس دوران میں ساری توجہ مکالموں پر مرکوز کرنا ہے جو ایک طرف تو پہلے کا قصہ اور اس کا پس منظر بیان کرتے ہیں۔ اور دوسرے اس کلائمکس کے لئے ذہن کو تیار کرنا ہے جس پر ڈرامے کی تعمیر کی گئی ہے۔ اسٹیج ڈرامے کے نقطۂ نظر سے یہ کافی دشوار کام ہے اور جب تک اداکار بے حد منجھے ہوئے نہ ہوں یا صورتحال میں ضرورت سے زیادہ کی کیفیت پیدا نہ کر دی جائے۔ اس وقت تک صرف مکالمے ڈرامے کی دلچسپی قائم نہیں رکھ سکتے۔ میرزا نے ابتداء میں انتظار کی کیفیت پیدا کر کے پھر اسٹیج کی ترتیب اور بے تکلفی کی مدد سے دلچسپی قائم رکھی ہے۔

اب آگے بڑھیئے "صغری داخل ہوتی ہے۔ یہ دس گیارہ سال کی بچی ہے جس کی گردن میں ڈھولک لٹک رہی ہے۔" یہ گویا بوڑھیوں کے مجمع میں ایک تسکین بخش تنوع پیدا کرتی ہے۔ اسٹیج پر اس کی موجودگی کا عرصہ کافی مختصر ہے لیکن "سارے محلے کو لیکر آنے کا وعدہ" اور پھر "موڑ پہ جا کر آپا کا انتظار کرنے" چلے جانا مسرت اور انتظار کی اس لہر کو گویا پیش کر دیتے ہیں جو محلے بھر میں دوڑ گئی ہے۔

آپ نے اندازہ کیا، کس طرح آہستہ آہستہ ڈرامہ نگار آپ کو بھی اسی محلے کا ایک فرد بنانے پر تلا ہوا ہے کس طرح وہ آپ کے اشتیاق کو اشتعال بخش رہا ہے اور ایک واقعہ کو، جو حساں کی نجی زندگی سے متعلق ہے آپ کے لئے جذباتی معنویت سے معمور کرتا جا رہا ہے۔ یہاں بھی میرزا کے ایک آدھ مکالمے سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ مثلاً صغری کے دو مکالموں کا مقابلہ کیجئے۔ پہلا اس کے کردار کو پورے طریقے پر بیان کر دیتا ہے، اور اسٹیج پر ایک کھلنڈری فضا قائم کر دیتا ہے۔ دوسرا اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے نامناسب ہے۔

پہلا مکالمہ ہے:

صغریٰ: مٹھائی ——— اماں خوشی سے ڈھولک پر زور زور سے ہاتھ مارتی ہے۔"

اور دوسرا ہے:

"خالد (سنجیدہ منہ بنا کر) بعض بچے بڑے بدتمیز ہوتے ہیں، میں صرف اپنی بہنوں ہی کو لاؤں گی، شور کرنے سے فیدہ بھلا۔"

یہاں زبان کے اعتبار سے یا تو "فیدہ" والا کچا لہجہ ہی قائم رکھنا چاہیئے تھا۔ جس صورت میں "بعض" اور "صرف" کے الفاظ بہت بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں۔ اور یا پھر "فیدہ" کا لفظ نامناسب ہوگا۔ دوسرے بعض بچوں کے بدتمیز ہونے کا یہ ادعا اس شکل میں صغریٰ پر نہیں پھبتا۔

لیکن میرزا کی کاریگری میں کلام نہیں۔ کھلنڈرے پن کی اس لہر کے بعد فوراً ڈرامہ نسبتاً سنجیدہ لہجہ اختیار کرنے لگتا ہے۔ رکھی سوچنے لگتی ہے کہ "انسان کو زندہ رہنے کے لئے کیسے کیسے سہارے مل جاتے ہیں۔" اور حسنا اسی جگہ پر ڈرامے کا گویا سب سے عظیم سچ بولتی ہے۔ "ماں کا دل تو ایک سمندر ہوتا ہے... جس میں دکھوں اور غموں کے ہزاروں پہاڑ چپ چاپ سما جاتے ہیں۔" اور پھر ایک آہ بھر کر کہا ہوا یہ جملہ کس قدر دل نشین لہجے کے ساتھ سامنے آتا ہے:

"کیا کریں، زندہ تو رہنا ہی پڑتا ہے۔ صبر تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

ایسا لگتا ہے جیسے آپ نے ابھی ابھی غالبؔ کا وہ شعر پہلی بار پڑھا ہے:

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

لیکن ان جملوں کو ڈرامے کی کمزوری کہا جائے یا خوبی۔ کیونکہ ان میں وہ خیال مجرد شکل میں بیان کیا گیا ہے جسے ڈرامہ مختلف واقعات اور کرداروں کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ اگر یہ جملہ تقریر کی صورت میں آتا یا اس کے کردار کے لئے مناسب نہ ہوتا جس کے منہ سے کہلوایا گیا ہے تو یقیناً یہ جملہ ایک دھبہ بن جاتا۔ لیکن اس جگہ پر جہاں رکھی

اور حسناں دونوں ایک نچلے متوسط طبقے کی حقیقی زندگی کی تصویریں بن جاتی ہیں، یہ جملہ بے ساختہ ان کے لبوں پہ آجاتا ہے۔ اور اس لئے ڈرامے کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔

کلائمکس شبیر کی صورت میں آتا ہے۔ اس سے فوراً پہلے رکھی کا یہ مکالمہ بڑا ہی المناک اور اہم ہے جو وہ حسناں کے جواب میں کہتی ہے:

حسناں : قدرت کا کارخانہ تو اسی طرح چلتا رہتا ہے۔

رکھی : چلنے دو ہمیں کیا؟ یہ بتاؤ کوئی اور کام باقی تو نہیں؟

اور اس مقام پر شبیر کی آمد اس بات کا اعلان ہے کہ اصل کام تو ابھی باقی ہے شکستِ آرزو، اور اس کو سمندر ایسے دل، میں سما لینے کا کام۔ شبیر کے بارے میں ہمیں کوئی اطلاع نہیں، لیکن جب وہ یہ اطلاع دیتا ہے کہ جس گاڑی سے مہمان آنے والے تھے اس کی ٹکر ہوگئی ہے تو ہم کلائمکس تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ڈرامے کا نقطۂ عروج ہے یہاں انتظار کی کیفیت بھی اپنے شباب پر ہے۔

ناظرین کی ساری توجہ اس بات پر مرکوز ہو جاتی ہے کہ ریل گاڑی کے اس حادثے میں حسناں کی بہو اور پوتے کا کیا ہوا، کچھ منٹ اسٹیج پر افراتفری اور بے قراری سے گزرتے ہیں۔ رکھی صرف ایک سہارے پر بھروسہ رکھتی ہے کہ "خط میں صاف لکھا تھا اگر خالہ ساتھ جانے پر تیار ہوئی تو سعیدہ آئے گی ورنہ میں اگلے مہینے خود اسے چھوڑ جاؤں گا۔"

پھر جب صغریٰ داخل ہوتی ہے تو اس کی آہٹ پر ہم کسی ایسے قاصد کا انتظار کرنے لگتے ہیں جو ہماری حالتِ انتظار کو ختم کر سکے اور آنے والوں کے بارے میں کوئی خبر سنا سکے۔ اور پھر جب عباس کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس گاڑی سے نہیں آئے تو خود دیکھنے والوں کو بھی اعصابی تسکین محسوس ہوتی ہے۔

خاتمہ کے قریب جذبات کا یہ امتزاج بڑا ہی خوشگوار ہو جاتا ہے خصوصاً اس وقت جب ایک معمولی بہانے سے حسناں کو سٹیج سے غیر حاضر رکھا گیا ہے ہمیں حسناں کی زندگی

کے تازہ ترین زخم کا علم ہو جاتا ہے۔ اس ترکیب سے ایک طرف تو ڈرامہ حسناں کے میلو ڈرامائی ردِ عمل سے بچ جاتا ہے۔ اور دوسری طرف بڑا ہی خاموش نرم و نازک تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

صغریٰ جو مٹھائی کے لئے بچوں کو بلانے گئی تھی تار لئے ہوئے اندر داخل ہوتی ہے اور عباس اسے پڑھ کر رکھی کو بتاتا ہے کہ "بچہ مر گیا" اور عین اس وقت نیچے مٹھائی لینے کے لئے آنے والے بچوں کا شور سنائی دیتا ہے۔ یہ تاثر بڑا مکمل تاثر ہے جس میں ایک ساتھ غم، ہمدردی، انسان کی تابِ مقاومت اور تقدیر کی ستم ظریفی کے احساسات شامل ہیں۔ اس تاثر میں دکھ اور رنج اتنا نمایاں نہیں جتنا کہ دکھ اور رنج سے پیدا ہونے والا لطیف تاثر۔ اس کیفیت کو ارسطو کے الفاظ میں "دردمندی سے دہشت دور ہو کر اس کے ذریعہ ہیجانات کی تطہیر" کرنے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اس تاثر میں گویا یونانی المیہ اور سنسکرت ڈراموں کے بنیادی فلسفہ کا امتزاج ملتا ہے۔ ایک طرف فطرت اور مشیت سے جنگ کرنے کا حوصلہ اور پھر اس سے ہم آہنگ ہو جانے یا اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کی ادا۔

یہی نہیں ابھی اس کا آخری جملہ باقی ہے جو بیک وقت بڑا ہی معصوم اور المناک ہے۔ حسناں جسے ابھی تک اس حادثے کی خبر نہیں ہے باورچی خانے سے آواز دے کر رکھی کو ہدایت کرتی ہے:

"رکھو! بچے آئیں تو انہیں یہیں بھیج دینا۔"

میرزا کے اس ڈرامے کا ایک حسن یہ بھی ہے کہ باقاعدہ یاد دلائے بغیر کسی کو یہ خیال آنا دشوار ہے کہ اس میں وحدتِ ثلاثہ کے تینوں عناصر پوری طرح ملتے ہیں یوں بھی چاہے اس پابندی کو اصولی طور پر تسلیم نہ کیا جائے لیکن آسانی کے لحاظ سے یہ وحدتیں کافی مفید اور مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ میرزا کے اس ڈرامے کو پڑھنے وقت

یہ قطعی احساس نہیں ہوتا کہ یہ پابندی کسی قسم کی آورد یا کوشش کے اثرات پیدا کر رہی ہے۔ یہ پابندی میرزا کے لئے مددگار اور معین ہے سدِّ راہ نہیں۔

یہاں سارا عمل ایک کمرہ میں واقع ہوتا ہے جس کی تعمیر اور فضا کچھ بہت زیادہ الجھی ہوئی یا مزین نہیں ہے، اس کے علاوہ وقت اصل واقعہ میں بھی صرف اتنا ہی صرف ہوتا ہے جتنا کہ اسٹیج پر پیش کیا گیا ہے یہ فن دراصل زندگی کو کسی ایک لمحے کی مدد سے اسیر کرنے کا فن ہے اور میرزا اس میں بڑے کامیاب ہوئے ہیں۔ پھر وحدتِ عمل کے اعتبار سے ساری توجہ صرف ایک ہی سیدھے سادے پلاٹ پر مرکوز رہتی ہے۔

سب ڈراموں کی طرح میرزا ادیب کے ڈراموں کے لئے سب سے پہلا سوال یہی پیدا ہوتا ہے۔ یہ ڈرامے کیوں لکھے گئے؟ یہ کن عمرانی، جمالیاتی اور فطری تقاضوں کو پورا کرتے ہیں؛

یہ ڈرامے سماجی آویزش سے پیدا ہوئے ہیں ان کا احاطہ کمال مختصر اور محدود ہے۔ ان میں یونانی کلاسیکی ڈرامے کی ہمہ گیری اور عظمت نہیں ہے۔ یہ عموماً ایک ایکٹ سے آگے نہیں بڑھتے، اور اس ایک ایکٹ میں زندگی کے صرف ایک چھوٹے سے بے حد مختصر کنولیس کو پیش کرتے ہیں، یہ چاول پر قل ہو اللہ لکھنے کا شغل نہیں، جزو سے کل تک، تخصیص سے تعمیم تک پہنچنے کی کوششیں ہیں:۔

ان ڈراموں کے لکھنے کا ایک ہی جواز ہے۔ میرزا ادیب کو انسانی زندگی کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ ان کے پاس زندگی کی تنقید کا ایک زاویۂ نظر ہے۔ ایک ڈرامہ نگار کی طرح میرزا بھی اقبال کی اس آواز سے مسحور ہیں:۔

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازو
گفتم کہ نمی سازو گفتند کہ برہم زن

"گفتم کہ نمی سازد" میرزا کے ڈراموں کا بنیادی آہنگ ہے۔

آخر وہ نظریۂ زندگی کیا ہے جسے میرزا تنقیدِ حیات کے سلسلے میں کام میں لاتے ہیں۔ اس سوال پر بحث کرنے سے پہلے خود میرزا ادیب کی شخصیت کا ایک مختصر تعارف ضروری ہے۔

میرزا ادیب اردو افسانہ نگاری کے رومانوی دور کی اہم شخصیت ہیں۔ اس وقت جب ایک طرف رومانوی افسانہ نگار ماورائیت اور طلسم سازی میں مصروف تھے اور دوسری طرف آرزومندی اور آزادی کے باغیانہ تصورات جذباتیت کے شوخ رنگوں میں ظاہر ہو رہے تھے، میرزا ادیب، صحرا نورد کے رومان اور، صحرا نورد کے خطوط، میں اس رومانوی شوخی اور تندی کو، سخن کا پردہ، بنانے میں محو تھے۔ وہ جنگ، صحرا نورد، اور قبائلی زندگی کے پس منظر میں نئے دور کے احساسات اور مسائل کو تمثیلی انداز سے پیش کر رہے تھے۔

رومانوی ذہن کی ایک خصوصیت ہے۔ وہ باغی ہونے کی حد تک تغیر پسند ہوتا ہے۔ میرزا کے ہاں تغیر پسندی ہے۔ کہیں کہیں جذباتیت بھی ہے لیکن وہ گھن گرج اور طوفانی آہنگ نہیں ہے جو افراط و تفریط سے پیدا ہوتا ہے زندگی پر میرزا ادیب کا اعتراض یہی ہے کہ اس میں میانہ روی اور اعتدال معدوم ہو گیا ہے۔ میرزا سماجی زندگی کے ان غیر معتدل عناصر کو پیش کر دیتے ہیں۔ اور اسی سے کردار کا تقاضا اور ڈرامے کی بنیادی آویزش فراہم کرتے ہیں۔

چند ڈراموں پر نظر ڈالیے تو ان میں، مسافر ملے گا جس کا پس منظر بہت کچھ رومانوی ہے۔ خاور کی واپسی لبِ دم ماں کے سرہانے پر اس کی کہانی کا بنیادی خیال ہے، رقصِ شرر، ایک تصور پرست مصور شہاب کی کہانی ہے جو اپنے دوست کی ایک نظم کی تخیلی ہیروئن سے محبت کرنے لگتا ہے۔ غزالہ ایک ایسی محبوبہ کی داستان ہے جو مصور کے خیالوں میں بسی رہی۔ لیکن جب وہ اس کی زندگی میں آئی۔

تب اسے کوئی نہ پہچان سکا۔ "بچہ گاڑی" چوری ہو جانے سے پہلے مہران کے نزدیک بڑی منحوس تھی۔ لیکن اس کے بعد ہی اسے بہت عزیز ہو جاتی ہے۔ 'چور' میں ناہید پروفیسر کی ویران زندگی کے خلا کو پُر کرنے کی کوشش میں لگی رہنے پر بھی اپنے پرانے محبوب جبار کی محبت سے منہ نہیں موڑ پاتی۔ 'بہن' جمیلہ کی آپ بیتی ہے جو اپنی بہن سے احساس کمتری کی بناء پر بیمار ہوتی ہے اور جب ہسپتال میں اس کے اردگرد سب لوگ رنگ رلیوں میں مصروف ہیں تو اپنی نوکرانی کو بہن کہہ کر گلے لگا لیتی ہے اور پھر وہ دونوں ڈرامے "دیوار" اور اب وہ رنگینیٔ خیال کہاں"۔ "دیوار" میں نیر اپنی زندگی اپنی شرمیلی اور معصوم" چھوٹی بہن کے لئے وقف کرنے کے لئے اپنے محب فیضی سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ اور یہی چھوٹی بہن اس انکار کے چند لمحے بعد ایک اور شخص سے اپنے عشق کا اعتراف کرتی ہے "اب وہ رنگینیٔ خیال کہاں" میں ایک ہزار روپیہ کے نوٹ جو غلطی سے پڑے مل گئے ہیں، شوہر اور بیوی کے تعلقات کو چند لمحوں کے لئے بے حد خوشگوار بنا دیتے ہیں۔

ان ڈراموں میں ایک احساس مشترک ہے اور وہ یہ کہ حالات انسان سے کس طرح کھیلتے ہیں اور کس طرح سماجی زندگی ایک ایسے عدم توازن کا شکار ہو گئی ہے جہاں آرزوئیں شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتیں۔ قدریں بدلتی ہیں۔ الفاظ کے معنی اور آدرشوں کے مفہوم بدلتے ہیں اور پل جھپکنے میں عظیم مضحک اور مضحکہ خیز عظیم بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اب وہ رنگینیٔ خیال کہاں، میں روپیہ زن و شوہر کے تعلقات کو جس طرح ڈھالتا ہے۔ اس کی بڑی خوبصورت آئینہ داری کی گئی ہے اس قدر خوبصورت کہ آخر میں یہ کہنا دشوار ہے کہ طنز زیادہ گہرا ہے کہ مزاح زیادہ خوشگوار۔

میرزا ادیب کا نقطۂ نظر مایوسی نہیں، ان کے ہاں تازہ اور تابناک فکر ہے جو عصرِ نو کی طرف نتیجہ خیز اشارے کرتی ہے۔ کیا تصور پرست شہاب کی جنسی اور جذباتی ناآسودگی کی داستان ہمارے نوجوانوں کی نمائندہ نہیں ہے؟ کیا "بہن" کی تنہائی اور ویرانی میں

مصروف اور آباد دنیا میں عام نہیں ہے؟ کیا دو نسلوں کی آویزش نیر اور اختر کی محبت میں پوری طرح جلوہ گر نہیں ہوتی؟

اس طرح میرزا ادیب کا رویہ بنیادی طور پر انسانیت دوستی کا رویہ ہے۔ جو انسان کی آرزومندی اور حالات سے اس کی کشمکش کو دلچسپی اور روشن اعتماد کے ساتھ دیکھتا ہے۔

دوسری بات ان ڈراموں کے بارے میں یہ ہے کہ یہ سب گھریلو فضائیں آباد ہیں۔ ان میں غیر معمولی اور وسیع فضاؤں کا ذکر بہت کم ہے۔ بنیادی اصولوں کی آویزش تقریباً مفقود ہے۔ یہ نہ تو تاریخی اور شاہی درباروں کے قصے ہیں اور نہ برنارڈ شا کی طرح خیالات اور فلسفوں کی آویزش سے معمور ہیں۔

میرزا کا فن متوازن اور میانہ رو ہے۔ وہ برقی صدموں اور پُر شور دھماکوں کی بجائے خاموش چٹکیوں اور لطیف اشاروں میں بات کرتے ہیں۔ "بیٹا" کے علاوہ اور کسی ڈرامے میں اچانک موت یا خودکشی کو حیرت اور استعجاب کا عنصر پیدا کرنے کے لئے استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ میرزا کے نزدیک ڈرامائیت میلو ڈرامائیت سے الگ شے ہے۔ وہ حیرت خیزی میں خوشگوار عنصر کی موجودگی پر اصرار کرتے ہیں۔

اس لئے اکثر ڈرامے المیہ ہوتے ہوئے بھی سنگین اور دل ہلا دینے والے نہیں۔ ان میں مزاح اور ہلکی طنز کی چاشنی موجود ہے۔ اب وہ رنگینیٔ خیال کہاں، کا خاتمہ دیکھئے جب ایک ہزار روپے کا غیبی پیکیٹ غائب ہو چکا ہے اور کتاب کا سرورق بنانے کا معاوضہ کل پچاس روپے گھر میں آتے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے سینما جانے اور چائے وغیرہ بنانے کا پروگرام طے ہو چکا تھا کہ عین اس وقت ایک ہزار روپے کا طلسم ختم ہو جاتا ہے۔

عصمت: یہ گھر یونہی جہنم بنا رہے گا۔ میں اسی طرح تڑپتی رہوں گی۔

سرفراز: بات بھی سنو بیگم! معاملہ بڑا سنگین تھا۔

عصمت: اور یہ معاملہ سنگین نہیں کہ گھر میں ایک دمڑی بھی نہیں، سر پھٹا جا رہا ہے۔

اور پھر یہ آخری مکالمہ ملاحظہ ہو:

سرفراز: بیگم! موت تو نہیں آئی پبلشر آیا ہے۔ پچاس روپے دیے ہیں اس نے چند چیزیں تو آ ہی جائیں گی اس رقم سے۔ اٹھو میری رانی!

تجزیئے کے بعد ان ڈراموں کی ترتیب پر نظر کیجئے۔

یہ صحیح ہے کہ میرزا ادیب کی بنیادی دلچسپی واقعات کے پیش کرنے میں ہے۔ وہ کردار نگاری کو اس قدر اہمیت نہیں دیتے جتنی کہ عہد حاضر کے ڈرامہ نویس دینے لگے ہیں۔ میرزا کے کرداروں میں غیر معمولی کردار مفقود اور رومانوی کردار بہت کم ہیں

انفرادیت کو کچھ لوگ سماج دشمن، انفرادیت پرستی کے مترادف سمجھتے ہیں اور کردار کی تعریف ان کے نزدیک محض سپاٹ اور بے روح خاکے تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ انفرادیت سے میری مراد یہاں ان عادات اور اطوار سے ہے جو ایک انسان کو دوسرے سے الگ کرتی ہیں، ظاہر ہے ہر شخص کے سوچنے کا طریقہ اس کے نشست و برخاست کا انداز، اس کی باتوں کا لہجہ اور اس کا شعور ایک تمدنی وحدت کے اندر ہوتے ہوئے بھی مختلف ہوتا ہے اور جب تک ہم انسان کی یہ مکمل تصویر پیش نہ کریں۔ کردار نگاری کا حق ادا نہیں ہوتا۔

میرزا کے کردار عام زندگی کی تصویریں ہیں۔ ان میں تخیل پرست شہاب ہے، ایماندار سرفراز ہے، سمندر کا دل اور دکھوں کے لئے اتھاہ سمائی رکھنے والی ماں حناں ہے توہم پرست مہراں ہے۔ ان سب میں متوسط طبقے کی نمائندگی پوری طرح ملے گی۔ یہ کردار سپاٹ بے نمک اور مصنف کے ہاتھ کی کٹھ پتلیاں نہیں ہیں۔ ان کے اپنے توہمات ہیں، اپنی الجھنیں ہیں اور غور و فکر کا اپنا طریقہ ہے۔

اس کردار نگاری میں نمایاں اور ذہن کو مسحور کرنے والے انسان کم ملیں گے شاید اس وجہ سے کہ ان ڈراموں کی دنیا گھر کی چاردیواری میں محدود ہے۔ "بہن"، "میں ہسپتال

کی فضا میں بھی گھر کی دنیا سجائی گئی ہے اور گھر کے کردار تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ کم وبیش ایک ہی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس میں طوفانوں کی گنجائش نہیں البتہ خلش اور وہ بھی تیرِ نیم کش کی خلش مل سکتی ہے۔

کردار نگاری میں شاید سب سے اہم منزل مکالموں کی ہے، ظاہر ہے کہ یہ ڈرامے اپنی ادھوری شکل میں پیش کئے جا رہے ہیں، کیونکہ ان مکالموں کی اصل جگہ کتاب میں نہیں، اسٹیج پر ہوتی ہے اور اسی وقت ڈرامہ نگار اپنی بات کو پوری طرح کہتا ہے۔ اسٹیج کی فضا، اداکاری اور بولنے والے کا لہجہ مکالموں کو آدھے سے زیادہ حسن بخشتے ہیں۔ میرزا آسان سیدھی سادی بول چال کی زبان لکھتے ہیں۔ لیکن اس کے استعمال میں وہ کرداروں کی خصوصیات کے مطابق الفاظ تلاش کرنے اور اسی قسم کا لہجہ اختیار کرنے سے غافل نہیں رہتے۔

مکالموں کے سلسلے میں یہ سیدھی سادی اور موزوں زبان کافی دشوار منزل ہے۔ ہماری ڈرامائی روایت مرصع اور شاعرانہ نثر سے شروع ہوئی اور ابھی تک بر محل اشعار کا استعمال اور مسجع و مقفٰی عبارت اسٹیج کے لئے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہے۔ میرزا نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ مکالموں کا حُسن تصنع اور شاعرانہ طمطراق کی بجائے قدرتی بات چیت سے پیدا کیا جائے۔

کہیں کہیں میرزا کے یہاں مکالموں میں کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں۔ ممکن ہے کہیں کچھ مکالمے بہت طویل معلوم ہوں اور کسی جگہ پر ان میں، نثریت، اور بے نمکی آگئی ہو لیکن ان کے بارے میں ایک بات طے ہے، ان میں کوئی جملہ بھی بے کار نہیں لکھا گیا ہے کوئی ایک مکالمہ بھی محض الفاظ کے شوق اور بندش کی چستی، سے مسحور ہو کر رقم نہیں ہوا، یہ سب دراصل اس فکری وحدت کے جزو ہیں جو ڈرامے کے تاثر کو گوندھتی ہے۔

اس باب میں شبہے کی یقیناً گنجائش ہے، آیا یہ ڈرامے ہندو پاکستان میں کامیابی سے اسٹیج کیئے جاسکتے ہیں یا نہیں؟ اس سوال کے دو پہلو ہیں، ایک لفظ کامیابی میں مضمر ہے اور اس میں مالی کامیابی اور مقبولیت کا مسئلہ بھی شامل ہے اور دوسرا اسٹیج کیئے جانے کا سوال ہے جو ان ڈراموں کی تکنیک پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

جہاں تک مالی کامیابی کا تعلق ہے، ہندو پاکستان میں اسٹیج ہنوز ایک غیر معین اور ابتدائی حالت میں ہے۔ ابھی تک ہمارے تھیئٹروں پر سولہویں صدی کے مذاق کا قبضہ ہے اور بلند آہنگی پس منظر، شان و شکوہ، شاعرانہ نثر اور طوفانی گھن گرج ہی مقبول چلے آتے ہیں۔ ایسی حالت میں ایسے چھوٹے اور سیدھے سادے ڈراموں کی کامیابی کافی دشوار نظر آتی ہے۔ جن کا پس منظر گھر کی چار دیواری ہو اور جن کی بنیادی آویزش انسانی کردار اور اس کی قدروں کی بدلتی ہوئی نوعیت ہو۔

تکنیک کے لحاظ سے ان میں اکثر ڈرامے وقت، مقام اور عمل کی تینوں وحدتوں کی پابندی کرتے ہیں۔ "چور"۔ "اب وہ رنگینیٔ خیال کہاں"۔ "دیوار" ہی کو لے لیجئے۔ یہ سب کے سب ایک ہی کمرے میں کھیلے جاسکتے ہیں، پس منظر کے لئے بہت ہی معمولی ساز و سامان کی ضرورت ہے اور ان میں سے کسی کے لئے بھی تین پردوں سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ عمل کا دائرہ صرف چند گھنٹوں تک محدود ہے جو کہیں کہیں تو اس وقت سے حقیقی مناسبت رکھتا ہے جتنا کہ اسٹیج پر صرف ہوتا ہے۔ پھر عمل کے لحاظ سے ان میں صرف ایک تاثر اور ایک کہانی کے نقوش ملتے ہیں۔ پلاٹ میں کسی قسم کی ضمنی کہانی یا صورتِ حال نہیں ملتی، جتنا تاثر بھی پیدا کیا گیا ہے وہ خارجی واقعے سے اتنا متعلق نہیں ہے جتنا کہ اس ذہنی صورتِ حال سے وابستہ ہے جو الفاظ اور مکالموں کے ذریعے سے پیدا ہو جاتی ہے اس قدر مختصر وقفے اور کم ساز و سامان کے ساتھ اس ڈرامائی دنیا کی تعمیر یقیناً میرزا ادیب کا کارنامہ ہے۔

میرزا ادیب ان چند لوگوں میں سے ہیں جو خاموشی، متانت اور جفاکشی کے ساتھ

خوابیدہ راہوں پر سفر کرتے ہیں اور لالۂ صحرائی کی تربیت میں سر کھپاتے ہیں۔ ڈرامہ نگاری اردو ادب میں لالۂ صحرائی سے کم نہیں جس کی طرف توجہ کرنے والے ابھی بہت کم ہیں۔ اگر غور کیجئے تو ہمارے ڈرامے ہنوز عالمِ طفولیت میں ہیں جبکہ یارانِ تیز گام نے کب کا محمل کو جا لیا ہے۔ ہمارے ہاں "محوِ نالۂ جرس" رہنے والے بھی معدودے چند ہی نظر آتے ہیں۔

میں ان ڈراموں کو کمزوریوں سے بالاتر نہیں مانتا۔ مجھے اعتراف ہے کہ ان کا احاطۂ کمال محدود ہے اور یہ کلاسیکی عظمت سے زیادہ لطافتِ فکر کے نثر پارے ہیں، لیکن کیا ان ڈراموں کی خوبصورت رمزیت، لطیف طنز و مزاح اور قطرے میں دجلہ، اور جزو میں کل، کا نظارہ کرنے کی کاوش بذاتہٖ قابلِ قدر فکری سرمایہ فراہم نہیں کرتی؟

میں ہند و پاک میں ڈرامے کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں، قوم کی تہذیبی روایت کی تعمیر اور اس کے شعور کے ساتھ اسٹیج کی مقبولیت بھی پھیلے گی۔ اسٹیج ہی وہ اکیلی صنفِ فن ہے جو بیک وقت تمام فنونِ لطیفہ سے کام لے کر زندگی کی بھرپور نمائندگی کر سکتی ہے اس میں موسیقی کی کیفیت، رقص کی حرکت، شاعری کی رمزیت، الفاظ و افسانہ کا افسوں، پس منظر کی تعمیر کا جادو، مصوری کی لطافت، اداکاری کے بالیدہ فن اور چابکدستی کے ساتھ روشنی اور سائے کا استعمال ڈرامے کو ایک ایسا ہمہ گیر حسن بخشتے ہیں جو کسی دوسرے فن کی قدرت سے باہر ہے۔

میرزا ادیب کے ڈراموں کا یہ مجموعہ اس عظیم مستقبل کا معمار بھی ہے اور اشاریہ بھی ان میں نرمی ہے، تنقیدِ حیات کی کوشش ہے اور داخلی تجربوں کے گداز کو خارجی حقیقتوں کی سنگینی میں تبدیل کرنے کی کاوش ہے ایک ایسے دور میں جب ڈرامہ نگاری ادبی خاندان کا سب سے چھوٹا بچہ بنی ہوئی ہے اور روایتی سنڈریلا، کی زندگی گزار رہی ہے میرزا کے ڈرامے ایک لائقِ ستائش تاریخی فریضہ پورا کر رہے ہیں۔

اگر اس کاوش سے وقت اور ماحول کے تقاضوں کا احساس پیدا ہو سکے اور فنی شعور بیدار ہو سکے تو یقیناً میرزا کا فن حقیقی داد پائے گا۔

فن کار

سرفراز ...... مصوّر

عصمت ...... سرفراز کی بیوی

جیواں ...... بوڑھی ہمسائی جو ناک میں بولتی ہے

ان کے علاوہ دو آدمی

منظر

مصور سرفراز کا گھر جو ایک کمرے، ایک کوٹھڑی اور ایک دالان پر مشتمل ہے۔ کمرہ بیک وقت ڈرائنگ روم، باورچی خانہ، خواب گاہ اور سٹوڈیو بھی ہے اور اس لحاظ سے ادنیٰ درجے کا جتنا سامان ایک جگہ اکٹھا ہو سکتا ہے۔ سب کا سب اس کمرے میں بکھرا پڑا ہے۔

دیواروں پر سرفراز کی اپنی بنائی ہوئی تصویریں لٹک رہی ہیں جن کا رنگ روغن دھوئیں اور گرد و غبار سے خراب ہو چکا ہے۔

شمالی دیوار کے ساتھ چارپائی پر مصوّر کی بیوی عصمت لحاف اوڑھے لیٹی ہے۔ سوائے سر اور چہرے کے باقی سارا جسم لحاف کے اندر ہے۔ کمرے کے دوسرے کونے میں صحن والے دروازے سے ٹیک لگائے سرفراز کسی فکر میں غرق ہے۔ اس کے آگے ایک سفید کاغذ پڑا ہے۔ چند لمحے وہ سفید کاغذ کو گھور کر دیکھتا رہتا ہے۔ دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے سر کے بالوں میں کنگھی کرتا ہے۔ پھر پاس پڑی ہوئی تپائی پر سے کوئی کتاب اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دیتا ہے۔

کتاب چھوڑ دیتا ہے، بڑی سُلگاتا ہے اور اس کے کش لینے لگتا ہے۔

عصمت کھانستی ہے، سرفراز اٹھ کر اس کی طرف جاتا ہے۔

سرفراز : ابھی طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی کیا۔ سر کا کیا حال ہے ؟

عصمت : (لہجے میں بیزاری) خاک ٹھیک ہوئی ہے طبیعت، سر میں سخت درد ہے۔

سرفراز : بُری خبر!

عصمت : سر پھٹا جا رہا ہے، اور وہ جو رات دال کھائی تھی اس کی وجہ سے معدہ بھی خراب ہے ـــ کھانسی بھی شروع ہو گئی ہے تم کہو (کھانستے ہوئے) ٹائیٹل بنا لیا ہے نا؟

سرفراز : ٹائیٹل ـ او ہوں (نفی میں سر ہلاتا ہے) کچھ سوجھ ہی نہیں رہا بناؤں کیا؟

عصمت : (ذرا چیخ کر) ہائے صبح سے بیٹھے ہو اور ابھی تک ٹائیٹل ہی نہیں بنا سکے۔ خبر ہے پبلشر کو چار بجے آنا ہے۔ کیا دو گے اسے۔ یونہی پیسے دے دے گا نا وہ، خیرات میں۔ توبہ ـــــــ دو دن سے چیخ رہی ہوں کہ تمام کی تمام رقم ختم ہو چکی ہے۔ تکیے کے نیچے صرف تین روپے سات آنے پڑے ہیں۔ کب تک گذارہ ہوگا ان میں۔ ایک مصیبت ہو تو انسان سہے بھی۔ تم نے تو لٹیا ہی ڈبو دی ہے۔

(سرفراز بڑی کے جلدی جلدی کش لیتا رہتا ہے)

سرفراز : بیگم! میں کیا کروں آخر؟ دماغ کام ہی نہیں کرتا۔ تمہیں کچھ بتاؤ۔ کیا کروں؟

عصمت : مزے سے فاقے کرو اور ساتھ ہی مجھے بھی مار دو۔ اور کیا کرو گے تم بھلا۔ (جیسے درد سے بے قرار ہو) ہائے پیٹ۔

سرفراز : کیا ہوا؟

عصمت : درد ہے پیٹ میں، دیکھتے نہیں؟

سرفراز : ابھی تو سر میں درد تھا؟

عصمت : تو کیا پیٹ میں درد نہیں ہو سکتا. کس شان سے فرمایا جاتا ہے (نقل اتارتے ہوئے) ابھی تو سر میں درد تھا.

سرفراز : (ہنس کر) خوب!

عصمت : اب مذاق کی سوجھ رہی ہے حضور کو!

سرفراز : ہرگز نہیں. تمہارے سر میں درد ہو —— پھر پیٹ میں بھی ہونے لگے اور میں مذاق کروں؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا!

عصمت : تمہیں درد ہو تو پتہ چلے نا!

سرفراز : میں نے ہزار بار کہا ہے یہ دال وال نہ پکایا کرو.

عصمت : اچھا جی نہیں پکایا کروں گی —— مگر ہر روز سبزی گوشت کہاں سے آئے گا؟ اوقات کیا ہے ہماری؟ اگر یہی حالت رہی اور تمہارا دماغ یونہی بیکار رہا تو ایک روز یقیناً دال بھی نہیں پک سکے گی. اور کیا؟ ابھی دھوبی کو پیسے دینا ہیں، سبزی والے کے الگ مقروض ہیں اور صبح ہی صبح اماں فاطمہ بھی قرض کا تقاضا کرنے آگئی تھی. کیوں نہ مانگے اپنا روپیہ. کتنے دن گزر چکے ہیں! کچھ خیال بھی ہے جناب کو؟

سرفراز : مابدولت کو سب کچھ خیال ہے.

عصمت : مابدولت کی حالت تو کوئی دیکھے آکر (آہ بھر کر) اللہ ہی جانتا ہے، کس طرح زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں. نہ تن پہ کپڑا نہ پیٹ میں روٹی وہ کون سی اللہ ماری گھڑی تھی جب اس منحوس گھر میں قدم رکھا تھا؟

سرفراز : بیگم! رائی کا پہاڑ مت بنا لیا کرو.

عصمت : اچھا تو ہم رائی کا پہاڑ بنا رہے ہیں. گھر میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے نا؟

سرفراز : دیکھو نا بیگم! (لہجے میں سنجیدگی) میں کہتا ہوں.

عصمت : کیا کہتے ہیں آپ؟

سرفراز : بیگم! تمہیں معلوم نہیں تمہاری یہ حالت دیکھ دیکھ کر میرا دل کس قدر کڑھتا

رہتا ہے، مگر کروں کیا؟ کس کا دل نہیں چاہتا کہ اطمینان سے زندگی بسر کرے۔

عصمت : تمہارا دل تو بالکل نہیں چاہتا :

سرفراز : یہ کس طرح کہہ سکتی ہو تم ؟

عصمت : ذرا غور کرو، تمہارے دوست اور ساتھی کہاں سے کہاں جا پہنچے ہیں، لیکن تم ابھی تک وہیں کے وہیں ہو، بلکہ اور پیچھے ہٹ گئے ہو۔ ترقی دنیا میں عقل مند آدمی کرتے ہیں، بے وقوف نہیں۔

سرفراز : سچ کہتی ہو بیگم! اس سے زیادہ بے وقوفی اور کیا ہوگی کہ مصوری کو ذریعۂ معاش بنائے بیٹھا ہوں۔ کوئی انتہا بھی حماقت کی۔

عصمت : توبہ! کس طرح بات کو مذاق میں ٹالا جا رہا ہے۔

سرفراز : بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے کوئی اور کام شروع کر دیا جائے پر اور کوئی کام کر ہی نہیں سکتا۔ اب کہاں نئی دنیا بسائی جائے گی ؟

عصمت : تو مزے کرو۔ صبح سے ایک ٹائیٹل بھی نہیں بن سکا۔

سرفراز : یہ تو درست ہے

عصمت : اب ہوگا کیا ؟

سرفراز : میرا خیال ہے بیگم! اگر اس وقت گرم گرم چائے کا ایک آدھ کپ پی لیا جائے تو ممکن ہے سوئی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھیں !

عصمت : ہاں یہ تو ہوگا ہی ــــ گلا گھونٹ کر کیوں نہیں مار دیتے۔ ہمیشہ کے لئے قضیہ ہی ختم ہو جائے، ورنہ ــــ سے سر پھٹا جا رہا ہے۔ پیٹ میں درد الگ ہے۔ کھانسی رکنے کا نام نہیں لیتی، اس پہ فرمایا جا رہا ہے گرم گرم چائے تیار کر دو! توبہ میرے اللہ! ــــ ستا لو جی بھر کے پھر شاید کبھی موقعہ نہ ملے۔ (انگلیوں سے رخسار اس طرح پونچھتی ہے جیسے رو رہی ہو)

سرفراز : ارے بھئی اس قدر بگڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ بازار میں کئی ہوٹل ہیں اور ہر ہوٹل سے چائے منگوائی جا سکتی ہے۔

عصمت : یونہی بگڑ رہی ہوں نا!

سرفراز : اور کیا؟

عصمت : جی ہاں! دماغ جو خراب ہو گیا ہے کیوں نہ بگڑوں گی بھلا؟

سرفراز : دیکھو بیگم۔

عصمت : چھوڑ آؤ پاگل خانے میں جاکر۔ کہیں تمہیں کاٹ نہ کھاؤں۔

سرفراز : آخر ہو کیا گیا ہے تمہیں؟

عصمت : (سچ مچ روتے ہوئے) یونہی بگڑ رہی ہوں۔ یہ بات کہتے ہوئے شرم تو نہیں آتی؟

سرفراز : (خفا ہو کر) بیگم! میں یہ ہر وقت کے طعنے برداشت نہیں کر سکتا، میں پوچھتا ہوں آخر شادی کیوں کی تھی، کیا تمہیں خبر نہیں کہ ایک فن کار کی اس ملک میں مالی حالت کیا ہوتی ہے اب چیخ کیوں رہی ہو، اس روز روز کی چیخ پکار نے تو میری زندگی کو ایک جہنم بنا دیا ہے۔

عصمت : اور میری زندگی جنت ہے نا؟ دیکھتے نہیں کتنا آرام میسّر ہے مجھے دو دن سے چارپائی پر پڑی ہوں ۔ سارا گھر کباڑ خانہ بن گیا ہے۔ کوئی چیز بھی ٹھکانے پر نہیں رہی۔ نفاست تو تمہیں چھو کر بھی نہیں گئی۔ بڑے مصور بنے پھرتے ہو اور گھر کا یہ حال ہے۔

سرفراز : گھر کی صفائی میرا نہیں تمہارا فرض ہے۔

عصمت : اب میں قبر سے اٹھ کر آؤں گی گھر کی صفائی کے لئے۔

(وقفہ)

سرفراز : بیگم! (نرم لہجے میں) میں نے کہا

عصمت : (بدستور گرم لہجے میں) کیا ہے کوئی کسر باقی رہ گئی ہے کیا؟

سرفراز : ذرا تحمل سے کام لو۔

عصمت : تحمل سے کام لیتے لیتے تو قبر کے کنارے پہنچ چکی ہوں۔
سرفراز : (گرج کر) تم تو پاگل ہو گئی ہو اور مجھے بھی پاگل کر کے چھوڑو گی۔
عصمت : یہی ہو گا آخر کار
سرفراز : زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں۔ گلاس کہاں ہے ؟
عصمت : کیا خبر مجھے ؟
سرفراز : (کونے میں برتنوں کا ڈھیر دیکھ کر) یہ تو سب کے سب گندے ہیں۔
عصمت : صاف کون سی چیز ہے اس گھر میں ؟
سرفراز : (ایک گلاس اٹھا کر) جی چاہتا ہے سب کے سب پھینک دوں باہر گلی میں۔ ایک برتن بھی صاف ستھرا نہیں۔
عصمت : تو میں سر پیٹوں اپنا ؟
سرفراز : (گرج کر) بس اب خاموش رہو۔ انتہا ہو چکی ہے۔ زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں۔ گھر کیا ہے دوزخ کا نمونہ ہے۔

(سرفراز دروازہ کھول کر نکل جاتا ہے۔ عصمت نڈھال ہو کر سسکیاں بھرنے لگتی ہے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیتی ہے۔ چند لمحے گزر جاتے ہیں ——— سرفراز واپس آتا ہے۔ چہرہ سرخ ہے۔ بیوی کے پاس آ کر رک جاتا ہے عصمت ابھی تک سسکیاں بھر رہی ہے)

سرفراز : (آواز میں مسرت کی لرزش) بیگم

(عصمت جواب نہیں دیتی)

میں نے کہا عصمت بیگم !

(عصمت لحاف میں منہ چھپا لیتی ہے)

ارے منہ کیوں چھپا لیا ہے لحاف میں، ذرا دیکھو تو سہی ——— میں نے کہا، عصمت بالو! خدا کی قسم ایک ایسا حادثہ پیش آیا ہے کہ خوشی سے اچھل

پڑ وگی۔ ذرا دیکھو تو۔

عصمت: کیا ہے؟ (لہجے میں بیزاری) سونے مرنے دو مجھے۔

سرفراز: یہ دیکھو تو کیا ہے میرے ہاتھ میں (جیب سے ایک لفافہ نکالتا ہے)، دیکھو!

عصمت: میں نہیں دیکھتی! خدا کے لئے زیادہ پریشان نہ کرو۔ چھلانگ لگا کر مر جاؤں گی گلی میں۔

سرفراز: یوں نہیں مانو گی۔

(لحاف میں ہاتھ ڈال کر گدگدی کرتا ہے، لحاف ہٹ جاتا ہے)

عصمت: ہائے اللہ! چھوڑو ——— گدگدی کرتے شرم تو نہیں آتی ہو گی۔

سرفراز: دیکھتی کیوں نہیں؟

عصمت: کیا دیکھوں؟

سرفراز: (لفافے سے نوٹ نکالتے ہوئے) یہ نوٹ، سو سو کے۔

عصمت: کیا؟ (نوٹوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے) دکھاؤ!

سرفراز: اوہوں!

عصمت: (بیٹھ کر) کہاں سے آئے؟

سرفراز: ارے تم تو بیٹھ گئی ہو۔ ابھی تو قبر کے کنارے پہنچ گئی تھیں۔

عصمت: دکھاؤ ذرا!

سرفراز: (ذرا دور سے دکھاتے ہوئے) سچ مچ کے نوٹ ہیں۔ سادہ کاغذ نہیں۔

عصمت: ملے کہاں سے؟

سرفراز: (بیوی کے چہرے کو دیکھتے ہوئے) واہ! کیسی چمک آگئی ہے آنکھوں میں۔

عصمت: میں پوچھتی ہوں آئے کہاں سے؟

سرفراز: بس یہ سمجھ لو آج الہ دین کا چراغ ہمارے ہاتھ آگیا تھا۔ ادھر رگڑا ادھر جن حاضر ہو گیا، ہم نے حکم دیا، دیکھو آج ہماری بیگم خطرناک حد تک بگڑ رہی ہیں۔

بلکہ روٹھ کر قبر کے کنارے جا پہنچی ہیں، اس لئے فوراً ایک ہزار کے نوٹ لے آؤ، وہ لے آیا۔ قصہ ختم!

عصمت: بھئی مذاق وزاق چھوڑو۔ سچ سچ بتاؤ یہ لفافہ ملا کہاں سے۔ دیکھوں گی ذرا۔

(عصمت لفافہ لے لیتی ہے)

اس پر تمہارا نام بھی نہیں۔

سرفراز: لفافے پر میرا نام تو نہیں ہے —— مگر اور کس کا ہے؟

عصمت: نام نہیں تو ڈاکیا دے کیونکر گیا؟

سرفراز: ڈاکیا کہاں آیا تھا یہاں؟ دینے والے کا مقصد صرف یہ تھا کہ یہ نوٹ میرے پاس پہنچ جائیں، اور یہ پہنچ گئے ہیں۔

عصمت: کس نے دیے۔ کیسے ملے۔ معمہ کیا ہے یہ؟

سرفراز: آم کھانے سے غرض ہے یا پیڑ گننے سے؟

عصمت: بہر حال یہ تو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ آم گرے کس پیڑ سے ہیں؟

سرفراز: اس کی ضرورت نہیں۔ ہمیں روپوں کی اشد ضرورت تھی اور وہ ہمیں مل گئے ہیں۔ اور کیا چاہیئے؟

عصمت: بتاتے کیوں نہیں؟ خواہ مخواہ پریشان کر رہے ہو!

سرفراز: بات یہ ہے عصمت بالو! یہ کسی ایسے شخص نے بھیجے ہیں جسے میں جانتا ہی نہیں۔

عصمت: جسے میں جانتا ہی نہیں —— یہ کیا بات ہوئی بھلا؟

سرفراز: اگر جانتا ہوتا تو نام بتانے میں کیا حرج تھا؟

عصمت: ہے کون وہ؟

سرفراز: کوئی مداح میرے فن کا —— کوئی عقیدت مند —— جسے میرے فن سے گہری دل چسپی ہے۔

عصمت : رہتا کہاں ہے ؟

سرفراز : میں کہہ رہا ہوں کہ میں تو اس کا نام تک نہیں جانتا۔

عصمت : نام کیوں نہیں پوچھا ؟

سرفراز : مجھ سے ملتا تو نام بھی پوچھتا۔

عصمت : ملا بھی نہیں ؟

سرفراز : اوہنوں !

عصمت : ہائے اللہ ! یہ پہیلی کیا ہے ؟ خدا کی قسم بہت پریشان کر رہے ہو مجھے۔

سرفراز : بیگم ! واقعہ صرف یہ ہے کہ تم سے لڑ کر باہر جا رہا تھا کہ باہر ڈیوڑھی والے دروازے کے پاس ایک لفافے پر نظر پڑی ——— یہی ہے وہ لفافہ کھولا تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔

عصمت : وہاں کس نے رکھا ؟

سرفراز : یہ عقیدت مندی کے کرشمے ہیں۔

عصمت : پہلے تو کبھی یہ کرشمہ نہیں ہوا تھا۔ آج یکایک کیسے ہو گیا ؟

سرفراز : ہر روز یہ کرشمے نہیں ہوتے۔

عصمت : تمہارا بھی کوئی عقیدت مند ہو گا ——— یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ مگر اس بھلے مانس نے لفافہ ہاتھ میں دیا ہوتا۔ منی آرڈر کے ذریعے بھیجا ہوتا۔ رجسٹری کی ہوتی۔

سرفراز : یہ بات تمہارے ذہن میں کبھی نہیں آئے گی۔

عصمت : کون سی بات ؟

سرفراز : عقیدت مندی کا جذبہ تکلف سے بہت بلند ہوتا ہے۔ عقیدت مند جب اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے تو وہ احسان نہیں کرتا۔ کیا سمجھیں ؟

عصمت : پھر بھی ——— اور پھر یہ بھی دیکھو۔ ڈیوڑھی میں پھینک گیا تھا۔ اگر کسی اور کی

نظر پڑ جاتی تو ــــــ

سرفراز : کیسے پڑ جاتی ؟

عصمت : جیسے تمہاری پڑ گئی ہے ۔

سرفراز : میرے لئے تو یہ ہے ہی ۔

عصمت : میں کچھ سمجھ نہیں سکی ۔

سرفراز : اس میں الجھن کیا ہے آخر ؟ معاملہ بالکل صاف ہے ، یہ میرے کسی عقیدتمند کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے ۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں ابھی پرسوں کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ ایک مصنف بڑی تنگ دستی سے گزر اوقات کر رہا تھا ۔ ایک دن صبح ہی صبح اسے ایک لفافہ ملتا ہے کھول کر دیکھتا ہے تو اس میں دس ہزار کا چیک موجود ہے ۔ ظاہر ہے یہ اس کے کسی عقیدت مند نے ازراہِ عقیدت اسے بھیجا تھا رڈیارڈ کپلنگ کا یہ واقعہ تو بہت مشہور ہے کہ کپلنگ کو کسی کا روپیہ ادا کرنا تھا ۔ اس نے چیک بھیج دیا مگر یہ چیک کبھی کیش نہ ہوا ۔

عصمت : کیوں ؟

سرفراز : جسے چیک ملا تھا وہ کپلنگ کا عقیدت مند تھا ۔ اپنے ممدوح کے دستخط اسے اس قدر عزیز تھے کہ اس نے چیک کیش ہی نہ کروایا ۔

عصمت : اچھا ؟

سرفراز : ہم کپلنگ بننے سے تو رہے تاہم مصوری کا فن بے آسرا ، اور بے سہارا بھی نہیں ہے ۔ آج تم نے دیکھ ہی لیا ہے ، خیر بتاؤ پروگرام کیا ہے ؟

عصمت : کیسا پروگرام ؟

سرفراز : یعنی اب ہمیں کرنا کیا ہوگا ــــــ میرا خیال ہے سب سے پہلے ڈاکٹر کے ہاں جائیں گے ۔ درد سے تمہارا سر پھٹا جا رہا ہے ۔ معدہ خراب ہے اور کھانسی بھی شدید ہے ۔

عصمت : اوہ (ذرا مسکرا کر) اس کی پروا نہ کرو ۔ تکلیف ہے مگر اس قدر نہیں کہ

فوراً ڈاکٹر کے پاس بھاگا جائے۔

سرفراز: تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔

عصمت: وہ تو ـــــ تم جانتے ہو آدمی جب پریشان ہوتا ہے تو ـــــ (مسکراکر) کسی قدر پاگل ہو جاتا ہے۔

سرفراز: مطلب یہ کہ ڈاکٹر کے ہاں جانے کی ضرورت نہیں۔

عصمت: جی نہیں!

سرفراز: پر بازار تو جانا ہی پڑے گا ـــــ تمہارے لئے دو جوڑے خریدنا ہی چاہیئں۔

عصمت: تمہارا لباس بھی تو ٹھیک نہیں۔

سرفراز: ایک آدھ جوڑا خرید لیں گے۔ اور ہاں یاد آیا وہ آویزے تو ضرور ہی خریدے جائیں گے جنہیں اس دن تم نے بڑی حسرت انگیز نظروں سے دیکھا تھا۔

عصمت: کون سے آویزے؟

سرفراز: وہی جو نازلی کے کانوں میں جھلملا رہے تھے۔ مجھے معلوم ہے وہ کس دکان میں بکتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمہارے لئے سینڈل تو آئیں گے ہی۔

عصمت: چوڑیاں ـــــ دیکھو نا ـــــ سب کی سب ٹوٹ چکی ہیں۔

سرفراز: بازار جائیں اور عصمت بالو کے لئے چوڑیاں نہ خریدیں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔

عصمت: اوہ ـــــ آج تو بڑی دریا دلی کا ثبوت دیا جا رہا ہے۔

سرفراز: میں دل کا بُرا نہیں ہوں عصمت بالو! جب گھر میں دریا بہنے لگے تو دریا دلی خود بخود آجاتی ہے۔ مگر جب قطرے کو ترس رہے ہوں، تو آدمی کتنا بُرا بن جاتا ہے۔

عصمت: تم بُرے نہیں ہو۔

سرفراز: یہ آج انکشاف ہوا تم پر!

عصمت: توبہ — کیسی بُری بات ہے۔

سرفراز: کون سی؟

عصمت: میں نے پریشانی میں نہ جانے تمہیں کیا کچھ کہہ دیا ہوگا۔ پاگل ہو گئی تھی نا۔

سرفراز: اب ایسی باتیں سوچنے کی ضرورت نہیں۔

عصمت: (لہجے میں شرمندگی کا احساس) سچ مچ مجھے اس کا بہت افسوس ہے معاف کردو!

سرفراز: بیگم! معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا —— میرا لہجہ بھی تو کافی تلخ ہو گیا تھا۔

عصمت: بہر حال، مجھے معاف کردو۔

سرفراز: اچھا بھئی اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو ہم نے معاف کردیا تم کو اور اپنے آپ کو بھی۔ اب تو خوش ہونا؟

عصمت: بڑی مہربانی!

سرفراز: کیسی عجیب بات تھی۔ ادھر ہم لڑتے رہے اور ادھر گھر کے دروازے پر زندگی مسرتوں کے شگفتہ پھول لئے ہمارا انتظار کرتی رہی۔ بیگم سچ کہتا ہوں جیسے ہی میری نظر لفافے پر پڑی کچھ یوں محسوس ہوا جیسے —— جیسے کچھ عجیب ہی کیفیت تھی وہ۔ دماغ کہتا تھا وہ چیز آگئی جس سے زندگی میں بہار آتی ہے، جس سے پژمردہ پھول کھل جاتے ہیں اور جس کے دامن میں قوس قزح کی رنگینیاں بکھری ہوتی ہیں۔

عصمت: کیسے شاعرانہ فقرے ہیں۔

سرفراز: آج تو جی چاہتا ہے خوب شاعری کی جائے۔ بہار کی رنگینیاں اور مسکراہٹیں ذہن پر نشہ سا برسا رہی ہیں۔ ہر شے پر خوبصورتی چھائی ہوئی ہے۔ اختر شیرانی

کا وہ شعر یاد آگیا ہے ۔

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو
کہ جو شے ہے نگاہوں کو حسیں معلوم ہوتی ہے

عصمت : میں نے اب عہد کر لیا ہے کہ آئندہ کبھی نہیں لڑوں گی ۔ کبھی تلخ بات زبان سے نہیں نکالوں گی ۔

سرفراز : ماضی کی باتیں ماضی کے ساتھ رخصت ہوگئیں مستقبل خوشگوار بنانا چاہیئے ۔

عصمت : یہ تو ہوگا ہی ۔

سرفراز : تو بیگم ! اگر تم اجازت دو تو جھٹ پٹ کتاب کا ٹائیٹل بنا دوں !

عصمت : جی چاہے تو بنا دو ، اور نہ چاہے تو نہ بناؤ ۔

سرفراز : ذہن میں ایک خیال آیا ہے ، واللہ پبلشر تڑپ اٹھے گا ۔

عصمت : بنا دو پھر ـــــ میں تمہارے لئے چائے بناتی ہوں ٹھیک ہے نا ؟

سرفراز : نا بھئی یہ غضب نہ کرنا ۔ تمہارا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے ۔

عصمت : اب چھوڑو بھی نا یہ قصہ ـــــ ٹھیک ٹھاک تو ہوں ۔

سرفراز : جیواں کو آواز دے لو ۔ لے آئے گی دودھ وغیرہ ۔

عصمت : اچھا !

(عصمت کمرے سے باہر نکل جاتی ہے ، سرفراز صحن والے دروازے سے ٹیک لگا کر تصویر بنانے لگتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ گنگناتا بھی جاتا ہے ۔

یہ کس کو ـــــ دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو
کہ جو شے ہے نگاہوں کو حسیں معلوم ہوتی ہے

عصمت واپس آتی ہے ، شوہر کو تصویر بناتے ہوئے دیکھتی ہے اور انگیٹھی میں کوئلے ڈالنے لگتی ہے ـــــ جیواں آتی ہے)

جیواں : (ناک میں بولتی ہے) کیاں ہیں ؟

عصمت: دودھ لے آؤ، آدھ سیر!

جیواں: آدھ سیر دودھ ــــ بالنس؟

سرفراز: رہنے دو، عصمت کتنے پیسے ہیں تمہارے پاس؟

عصمت: تین روپے اور شاید سات آنے!

سرفراز: جیواں! دو روپے کی مٹھائی لے آؤ ــــ دو روپے کی نہیں اڑھائی روپے کی، آدھ سیر دودھ اور باقی جو کچھ بچے وہ تمہارا۔

جیواں: واں واں ــــ آج تو عینش ہیں۔

سرفراز: عینش ہیں عینش۔

عصمت: تکئے کے نیچے پیسے پڑے ہیں اٹھا لو جا کر۔

جیواں: اچھا!

(جیواں تکیئے کے نیچے سے پیسے نکالتی ہے ــــ برتنوں میں سے گلاس اٹھاتی ہے اور باہر چلی جاتی ہے۔)

(سرفراز بدستور گنگنا رہا ہے ــــ عصمت اٹھ کر شوہر کے پاس آتی ہے)

عصمت: خوب!

سرفراز: میرا گانا یا ٹائیٹل؟

عصمت: یہ ــــ ٹائیٹل خوب سوجھا ہے۔

سرفراز: دیکھ لو! آج طبیعت زوروں پر ہے ــــ چاہوں تو اور دس کتابوں کے ٹائیٹل بھی بنا سکتا ہوں۔

عصمت: واقعی؟

سرفراز: دیکھ لو کتنی جلدی ٹائیٹل مکمل کر لیا ہے۔ بات یہ ہے جب طبیعت میں امنگ ہو تو ہر کام آسان ہو جاتا ہے۔ ٹائیٹل دیکھ کر مصنف اور پبلشر دونوں خوش ہو جائیں گے

عصمت: خوش نہیں ہوں گے تو اور کیا ہو گا؟

سرفراز : میں نے کہا بیگم ! ایک پلیٹ صاف کردو۔
عصمت : مٹھائی کے لئے ؟
سرفراز : ہاں !
عصمت : اچھا ! جیواں نہیں آئی ابھی تک !

(جیواں آتی ہے ایک ہاتھ میں گلاس اور دوسرے میں مٹھائی کا لفافہ ہے)

سرفراز : آتو گئی ہے۔
عصمت : بڑی لمبی عمر ہے جیواں تیری۔
جیواں : اَچھا ــــ کہاں رکھوں ؟
عصمت : دے دو مجھے۔

(جیواں دودھ والا گلاس عصمت کے پاس رکھ دیتی ہے
اور لفافہ ہاتھ میں پکڑا دیتی ہے)

جیواں : ہاں ــــ باہر تین آدمی پوچھتے ہیں۔
سرفراز : مجھے ــــ اچھا کون ہیں یہ حضرت ؟
عصمت : پبلشر وغیرہ ہوں گے ــــ یا شاید وہی لوگ (مسکراکر) آپ کے عقیدت مند۔

سرفراز : ہو سکتا ہے، دیکھتا ہوں باہر جاکر

(جیواں چلی جاتی ہے۔ سرفراز بھی دروازے سے نکل جاتا ہے
عصمت مٹھائی پلیٹ میں ڈالتی ہے اور اسے تپائی کے اوپر
رکھ کر رومال سے ڈھانپ دیتی ہے۔ سرفراز واپس آتا ہے)

عصمت : کون ہیں ؟
سرفراز : تین معزز آدمی ــــ کہتے ہیں ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔
عصمت : تو ــــ ؟

سرفراز : تو کیا ——— اندر بلانا چاہیئے انہیں ؟
عصمت : بٹھایئں گے کہاں ؟
سرفراز : تم کوٹھڑی میں چلی جاؤ ——— اور لباس تبدیل کرلو بازار جانے کے لئے میں چند منٹ ان سے باتیں کرتا ہوں۔ ہاں بٹھایئں گے کہاں ؟ چارپائی پر بیٹھ جایئں گے (لحاف لپیٹ کر رکھ دیتا ہے۔ دری کی شکنیں نکالنے لگتا ہے)
عصمت : اچھا !

(عصمت کوٹھڑی کے اندر چلی جاتی ہے۔ سرفراز دروازے کے پاس کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہتا ہے۔ تشریف لایئے۔ جناب ! " دو خوش پوش شخص اور ایک معمولی لباس میں ملبوس آدمی داخل ہوتے ہیں)

سرفراز : معاف کیجئے جناب ! ایک مصور کو اتنی توفیق کہاں کہ کوئی شاندار ڈرائنگ روم بنا سکے۔
پہلا آدمی : آپ تو ہمیں شرمندہ کر رہے ہیں۔
سرفراز : تشریف رکھیئے (چارپائی کی طرف اشارہ کر کے) بیٹھئے
(تینوں چارپائی کے اوپر بیٹھ جاتے ہیں)
دوسرا آدمی : یہ کمرہ ہماری نظروں میں خوبصورت سے خوبصورت ڈرائنگ روم سے بھی بہتر ہے کیونکہ یہاں ایک سچا فن کار کام کرتا ہے۔
سرفراز : یہ محض آپ کی ذرہ نوازی ہے۔
پہلا آدمی : اس میں ذرہ نوازی کو قطعاً کوئی دخل نہیں، مدت سے آپ کا ذکر سن رہے تھے۔
دوسرا آدمی : اور آج ملاقات کا اشتیاق کشاں کشاں لے آیا ہے۔

(سرفراز تپائی چارپائی کے قریب لے آتا ہے اور پلیٹ
پر سے رومال ہٹا دیتا ہے)

سرفراز: یہ لیجئے، میری قدر افزائی کیجئے۔

پہلا آدمی: یہ کیا —— اس قدر تکلف؟

سرفراز: نہیں صاحب! یہ میرا فرض ہے لیجئے نا!

(دونوں خوش پوش کھانے لگتے ہیں۔ تیسرا چپ چاپ
بیٹھا رہتا ہے سرفراز کی اس طرف نظر نہیں جاتی)

شرمندہ ہوں کہ خاطر خواہ تواضع نہیں کر سکتا —— ایک مصوّر ——

پہلا آدمی: ارے صاحب! آپ کیا ہیں، یہ ہم جانتے ہیں۔

سرفراز: ہاں تو —— اس عزت افزائی کا کچھ مقصد بھی ہوگا!

پہلا آدمی: جی ہاں —— ایک مقصد کے تحت ہی حاضرِ خدمت ہونے کا شرف حاصل کیا ہے۔

سرفراز: فرمایئے؟

دوسرا آدمی: اس سے پہلے ایک مختصر سی تمہید سن لیجئے۔

پہلا آدمی: میں عرض کرتا ہوں —— آج کل فن کی جو حالت ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں۔ آپ تو ماشاء اللہ خود اس دشت کی سیاحی میں مصروف ہیں۔

سرفراز: جی ہاں!

دوسرا آدمی: یہاں چند اہلِ درد نے ایک انجمن کی بنیاد رکھی ہے۔ اس انجمن کا مقصدِ حیات صرف یہ ہے کہ ان فنکاروں کی مدد کی جائے جو بد قسمتی سے مالی الجھنوں میں مبتلا ہیں اور فن کی طرف پوری توجہ نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کسی اثاثے کے بغیر یہ انجمن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

سرفراز: بجا فرما رہے ہیں آپ۔

دوسرا آدمی: یہ ایک ایسی بات ہے جس کی تائید ہر معقول آدمی کرے گا تو جناب ہم نے چندہ جمع کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔

سرفراز:۔ اس کے علاوہ سرمایہ جمع کرنے کی کوئی اور سبیل ہی نہیں۔

دوسرا آدمی: بالکل درست فرمایا آپ نے۔

پہلا آدمی: ہم جانتے ہیں آپ ایک فنکار ہیں اور آپ کی حالت عام فنکاروں سے مختلف نہیں ہوگی، تاہم یہ بھی خیال ہے ممکن ہے ان دنوں آپ کی کوئی تصویر فروخت ہو گئی ہو۔

سرفراز: تصویر فروخت نہیں ہوئی — یہاں یہ فن سمجھنے والے ہیں کتنے؟

پہلا آدمی: جی ہاں!

سرفراز: مگر آپ مایوس نہ ہوں

دوسرا آدمی: کیا فرمایا آپ نے؟

سرفراز: میں اس مقصد کے لئے ضرور چندہ دوں گا۔

پہلا آدمی: جب ان دنوں آپ کی کوئی تصویر ہی نہیں بکی تو آپ سے چندہ طلب کرنا مناسب بات نہیں ہوگی۔

سرفراز: نہیں صاحب! میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ میری طرف سے پچاس روپے کی حقیر رقم منظور کر لیجئے۔

دونوں آدمی: بیک وقت! جی!

سرفراز: کاش میں زیادہ دے سکتا

پہلا آدمی: مگر یہ آپ پر زیادتی ہوگی۔

(تیسرا آدمی بالکل نہیں بولتا۔ پاگلوں کی طرح انہیں دیکھتا رہتا ہے)

سرفراز: نہیں صاحب!

دوسرا آدمی: مگر دیکھئے نا — آپ کی حالت —

سرفراز: (مسکرا کر) اگر آپ ایک گھنٹہ پیشتر آتے تو پچاس روپے کیا، پچاس پیسے بھی نہ دے سکتا۔

پہلا آدمی: اچھا!

سرفراز: اب میں یہ رقم دے سکتا ہوں۔

پہلا آدمی: خوب! معلوم ہوتا ہے کہیں سے خزانہ مل گیا ہے۔

سرفراز: خزانہ کہاں سے ملے گا صاحب!

پہلا آدمی: بات تو کچھ ایسی ہی نظر آتی ہے۔

سرفراز: واقعہ یہ ہے کہ آج ہمارے کسی عقیدت مند نے عقیدت مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔

دوسرا آدمی: واقعی!

سرفراز: جی جناب!

پہلا آدمی: بہت نیک انسان ہوگا ـــ خدا سب کو ایسی توفیق دے، ویسے یہ کوئی خاص حادثہ نہیں ہے آپ ہیں ہی ایک عظیم مصوّر۔

سرفراز: آپ ایسا سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی بہت کرم فرمائی ہے، بلکہ بہت بڑا مبالغہ ہے۔

پہلا آدمی: ہم بالکل درست عرض کر رہے ہیں، ہمیں یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ ابھی دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ایک عظیم مصور کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ مگر یہ واقعہ کیا ہے؟

سرفراز: معمولی سی بات تھی ـــ ہوا یہ کہ چائے لینے بازار جا رہا تھا کہ یکایک ڈیوڑھی میں ایک لفافے پر نظر پڑی۔ اٹھایا تو اس میں ایک ہزار کے نوٹ تھے۔

دونوں آدمی: (ایک ساتھ) بہت خوب!

سرفراز: وہ کپلنگ والا واقعہ آپ کو یاد ہوگا ـــ یورپ میں یہ بات عام ہے۔

پہلا آدمی: واہ وا ـــ سرفراز صاحب! خدا کی قسم آپ واقعی ایک عظیم مصور ہیں۔ آپ نے تو ہمیں ذرہ برابر پریشان نہیں کیا۔

سرفراز: (گھبرا کر) جی؟

پہلا آدمی: ہمیں یقین نہیں تھا معاملہ اتنی جلدی صاف ہو جائے گا۔

سرفراز: میں سمجھا نہیں مطلب!

دوسرا آدمی: (ہنستا ہے) ایک فنکار ——— فنکار ہی ہوتا ہے۔

سرفراز: نہ جانے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

پہلا آدمی: ہم — یعنی میں اور یہ صاحب، دونوں خفیہ پولیس کے آدمی ہیں۔

سرفراز: (پریشان ہو کر) جی — مگر۔

پہلا آدمی: (تیسرے آدمی کی طرف اشارہ کرکے) اور یہ حضرت ——— ایک مجرم

سرفراز: میں کچھ نہیں سمجھ رہا۔

دوسرا آدمی: سنیئے سرفراز صاحب! آپ دیکھ رہے ہیں ہمارے ساتھ (تیسرے آدمی کی طرف اشارہ کرکے) یہ صاحب بھی ہیں۔ یہی ہے وہ شخص جسے آپ اپنا عقیدت مند سمجھ رہے ہیں۔ میں آپ کو پریشان نہیں کروں گا۔ اصل واقعہ بتلائے دیتا ہوں یہ شخص ایک مقامی بنک میں ملازم تھا۔ اچھا خاصا شریف آدمی سمجھا جاتا تھا۔ مگر آج اسے ہاتھ رنگنے کا موقعہ مل گیا۔ اس نے کام کرتے کرتے کچھ نوٹ اڑائے اور فوراً مینجر سے چھٹی لے کر بنک سے باہر نکل آیا۔ اسے اتفاق کہیئے کہ ہم دونوں ایک خاص کام سے بنک میں موجود تھے ——— ایک کلرک نے ان صاحب کو یہ حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ خبر اسی وقت مینجر کو پہنچائی گئی اور مینجر نے ہمیں خبردار کر دیا۔ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا ——— آپ سمجھتے جا رہے ہیں نا؟

سرفراز: (مردہ آواز میں) کہیئے!

دوسرا آدمی: تو جناب ہم نے اس کا تعاقب شروع کر دیا — اور دور جا کر پکڑ لیا۔ اس نے بک دیا کہ بنک سے ایک ہزار کے نوٹ اڑائے تو تھے مگر ہمیں دیکھ کر راہ میں کسی کے گھر میں پھینک دیئے! شک آپ کے مکان پر تھا — اور معاف کیجئے ہم نے آپ کو بہت پریشان کیا ہے، کیا کیا جائے، فرض ہر صورت ادا کرنا ہی

پڑتا ہے۔

سرفراز: جی!

دوسرا آدمی: وہ لفافہ عنایت فرمادیں، بنک کی رقم بنک ہی میں جانی چاہیئے۔

پہلا آدمی: ہوسکتا ہے آپ کے واقعی عقیدت مند موجود ہوں اور انہیں ابھی تک عقیدت کے اظہار کا موقعہ نہ ملا ہو۔

دوسرا آدمی: وہ لفافہ دے دیجئے، صرف ایک مرتبہ آپ کو اور تکلیف کرنا ہوگی عدالت میں!

سرفراز: مجھے ـــــ اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

پہلا آدمی: دیکھیئے نا سرفراز صاحب! بہ حیثیت ایک ذمہ دار شہری کے آپ پر کچھ فرض بھی عائد ہوتے ہیں ـــــ مگر یہ یقین رکھیئے آپ کو زیادہ سے زیادہ سہولت دی جائے گی۔

دوسرا آدمی: اچھا تو!

(سرفراز اٹھتا ہے ـــ کوٹھڑی کے اندر جاتا ہے۔ اس اثناء میں وہ دونوں آدمی ایک دوسرے کو مسکرا مسکرا کر دیکھتے رہتے ہیں، سرفراز واپس آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں لفافہ ہے جسے وہ پہلے آدمی کے حوالے کر دیتا ہے۔ پہلا آدمی نوٹ گنتا ہے اور لفافہ جیب میں ڈال لیتا ہے)

پہلا آدمی: معاف کیجئے آپ کو بہت تکلیف دی۔ اچھا خدا حافظ۔

دوسرا آدمی: آپ کا حسنِ سلوک ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا۔

(تینوں آدمی دروازے سے نکل جاتے ہیں عصمت باہر آتی ہے)

عصمت: (لہجے میں سخت غصہ) میں کہتی ہوں تم سا بے وقوف آج تک دنیا میں پیدا نہیں ہوا، لفافے کا قصہ بتانے کی ضرورت کیا تھی؟

سرفراز: وہ خفیہ پولیس کے آدمی تھے بیگم!

عصمت: مگران کے پاس اس کا کیا ثبوت تھا کہ لفافہ یہیں پھینکا گیا تھا تم نے خود انہیں اطلاع دی شیخی میں آکر۔

سرفراز: لیکن بیگم ——

عصمت: (آواز کاٹتے ہوئے) لیکن ویکن کیا! تم نے خود انہیں بتایا کہ میرے ایک عقیدت مند نے یہ لفافہ پھینکا تھا۔

سرفراز: وہ مجھے گرفتار کرا سکتے تھے بیگم!

عصمت: بڑے آئے مصور — کس شان سے فرمانے لگے ایک عقیدت مند نے عقیدت کا ثبوت دیا ہے۔ توبہ —— اللہ مجھے تو موت دے دے، چھوٹ جاؤں اس عذاب سے۔ کباب ہو گئی ہوں اس شخص کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر۔ کیا مجال جو کبھی عقل مندی کا کام بھی کر جائے۔

(رونے لگتی ہے)

یہ گھر یونہی جہنم بنا رہے گا —— میں اسی طرح تڑپتی رہوں گی

سرفراز: بات بھی سنو! بیگم معاملہ بڑا سنگین تھا۔

عصمت: اور یہ معاملہ سنگین نہیں کہ گھر میں ایک دمڑی بھی نہیں۔ سر پھٹا جا رہا ہے معدہ سخت خراب ہے، کھانسی آ رہی ہے۔ (کھانستی ہے) ہائے اللہ اٹھا لے مجھے اب تو۔ تیرا بڑا کرم ہو گا۔

(باہر دروازے پر دستک)

سرفراز: سنو ذرا۔ باہر کوئی ہے۔ شاید پبلشر ہے۔

(ٹائٹل اٹھا کر باہر نکل جاتا ہے)

عصمت: موت آئی ہے اب۔

(سرفراز باہر چلا جاتا ہے۔ عصمت بستر پر گر کر سسکیاں بھرنے

لگتی ہے۔ سرفراز لوٹ کے آتا ہے۔ ہاتھ میں نوٹ ہیں)

سرفراز: بیگم! موت تو نہیں آئی، پبلشر آیا ہے — پچاس روپے دیے ہیں اس نے — ٹائیٹل بہت پسند کیا ہے — چند چیزیں تو آہی جائیں گی اس رقم سے — اٹھو میری رانی!

(سرفراز اس کے شانے پر ہاتھ رکھتا ہے۔ عصمت برابر سسکیاں بھرتی رہتی ہے)

غزالہ

صفیہ ... . احمد کی بیوی

کلثوم ... . صفیہ کی خالہ زاد بہن

احمد .... صفیہ کا شوہر

رحیمن .... نوکرانی

منظر

صفیہ کا کمرہ۔ ایک طرف پلنگ، پلنگ کے اوپر چند بوتلیں، خالی گلاس، تھرمامیٹر اور کچھ پھل۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو ہم صفیہ کو پلنگ کے اوپر گاؤ تکیے سے سہارا لگا کر بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں، عمر چوبیس پچیس سے زائد نہیں ہوگی، بیماری کے باوجود نقش تیکھے اور کسی حد تک دلکش ہیں۔ دو تین لمحے خلا کو گھورنے کے بعد وہ تکیے کے نیچے سے ایک لپٹا ہوا کاغذ نکالتی ہے اسے کھول کر اس انداز سے پڑھتی ہے جیسے پہلے بھی اسے پڑھ چکی ہو، کیونکہ اس کی نظریں جلد ہی صفحے کے آخری حصے پر پہنچ جاتی ہیں۔

باہر قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ صفیہ جلدی سے کاغذ لپیٹ کر اسے وہیں تکیے کے نیچے رکھ دیتی ہے۔ کلثوم آتی ہے۔ کلثوم اس کی ہم عمر خالہ زاد بہن ہے ہاتھ میں دودھ کا گلاس ہے۔ صفیہ دودھ کا گلاس دیکھتی ہے اور بیزاری کے عالم میں منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے۔ کلثوم مسکرا کر اس کے قریب آتی ہے!

کلثوم: بھئی توبہ ہے بیمار آدمی اتنا مردم بیزار بھی نہیں ہو جاتا۔

صفیہ: اس میں مردم بیزاری کی کیا بات ہے۔ دودھ پینے کو جی نہیں چاہتا اور تم ہو کہ

بار بار لے آتی ہو۔

کلثوم: کھانا تو کھا نہیں سکتیں۔ دودھ بھی نہ پیو گی تو کتنی کمزوری ہو جاؤ گی۔ دودھ پینے کو جی نہیں چاہتا تو جوس لے آتی ہوں۔ بس دو منٹ میں ———— ٹھیک ہے نا؟

صفیہ: (تنگ آکر) ایک بار کہہ دیا جی نہیں چاہتا۔ تم لوگ خواہ مخواہ تنگ کرتے رہتے ہو۔

کلثوم: (گلاس تپائی پر رکھ کر) پھر وہی بات!

صفیہ: کون سی بات؟

کلثوم: بھول گئیں اپنا وعدہ —— تم نے مجھے یقین دلایا تھا کہ آئندہ بیماری کو بڑھنے نہیں دوگی، مگر میں دیکھ رہی ہوں ابھی تمہاری وہی حالت ہے۔ بات بات پر غصہ، بات بات پر تنک مزاجی۔ کس کی زندگی میں بیماری نہیں آتی، مگر ہر شخص تمہاری طرح کڑھنے نہیں لگتا۔ کڑھنے سے طبیعت زیادہ خراب نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا؟

صفیہ: پر میں کیا کروں۔ مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

کلثوم: اس طرح کڑھنے کی وجہ کیا ہے حیرت ہے تم جیسی ذہین عورت بھی یہ بات ابھی تک نہیں سمجھ سکی کہ خوش رہنے کی کوشش کی جائے تو بیماری کا آدھا اثر خود بخود زائل ہو جاتا ہے۔ اگر تمہارا یہی حال رہا تو سچ کہتی ہوں میں واپس اپنے گھر چلی جاؤنگی۔

صفیہ: (لہجے میں تبدیلی) ناراض ہو گئی ہو کلثوم؟

کلثوم: تم سنتی ہو میری بات —— یہ بخار کوئی اتنا خطرناک تو ہے نہیں کہ تم اسے اس طرح محسوس کرنے لگو۔ چند روز تک بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جاؤ گی۔ چند روز کوئی لمبی مدت تو نہیں۔

صفیہ: جاؤ گی تو نہیں تم —— مجھے افسوس ہے تمہارے ساتھ بھی تلخ کلامی ہو جاتی ہے حالانکہ تم میرے لئے سگی بہن سے بھی کچھ زیادہ ہو۔

کلثوم: ارے (صفیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر) عجیب طبیعت ہو گئی ہے تمہاری میں بھلا اپنی بہن کو اس حالت میں چھوڑ کر جا سکتی ہوں اپنے گھر، پر تم بھی تو ذرا ہوشمندی سے کام لینا سیکھو نا۔ خود ہی سوچو فائدہ کیا ہے اس قسم کی تنگ مزاجی کا خواہ مخواہ اپنے جی کو جلانا۔ بھائی جان بھی کئی بار مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ نہ جانے صفو کو کیا ہو گیا ہے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی ____ ان سے تو میں نے کہا ہے۔ بیماری کا تھوڑا بہت ضرر اثر ہوتا ہے ____ پر صفیہ! یہ ٹھیک نہیں ہے۔ کوئی تکلیف ہو تو بتا دو۔ آخر تمہاری خالہ زاد بہن ہوں۔ اور پھر تم خود ہی کہا کرتی ہو، کلثوم بڑی عقل مند عورت ہے، کہا کرتی ہو نا؟

صفیہ: میں کوشش کرونگی۔

کلثوم: کس بات کی؟

صفیہ: یہی کہ اب خوش رہا کروں۔

کلثوم: کیا اچھا ارادہ ہے۔ لو اب دودھ پی لو۔ شاباش۔

(کلثوم دودھ کا گلاس اٹھا کر صفیہ کی طرف بڑھاتی ہے۔ صفیہ دو تین گھونٹ پی کر گلاس تپائی پر رکھ دیتی ہے)

صفیہ: بس زیادہ نہیں پی سکتی۔

کلثوم: صرف دو گھونٹ۔ زیادہ نہیں۔

صفیہ: ٹھہر کر پی لوں گی۔

کلثوم: بھائی جان دوا لے کر آئے نہیں ابھی ____ بارہ بج گئے ہیں۔ بے چارے بہت پریشان رہتے ہیں تمہارے لئے۔

صفیہ: (لہجے میں دبا دبا طنز) جی ہاں!

کلثوم: پریشان نہیں رہتے کیا؟

صفیہ: رہتے ہوں گے ____ میں کیا جانوں۔

کلثوم : گویا ان سے بدگمان ہو۔

صفیہ : نہیں بابا! میں کسی سے کیوں بدگمان ہونے لگی؟

(احمد آتا ہے۔ ہاتھ میں دوا کی شیشی ہے درمیانے قد
کا خوش وضع آدمی ہے)

کلثوم : شکر ہے بھائی جان آگئے آپ۔ صفیہ تو بدگمان سی ہو گئی تھی۔

احمد : کیوں؟

کلثوم : اتنی دیر جو لگا دی آپ نے۔

احمد : ڈاکٹر نے کہا نہیں تھا یہ دوا ذرا مشکل سے ملے گی۔ سارا شہر گھوما ہوں جب جا کر کہیں ملی ہے۔ اب رہ گئی ان کی بدگمانی تو یہ کوئی غیر معمولی حادثہ نہیں ہے۔

کلثوم : نہیں بھائی جان ایسا مت کہئے۔

احمد : کیا یہ غیر معمولی حادثہ ہے؟

کلثوم : سنیئے! صفیہ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ بالکل خوش رہے گی۔

احمد : وعدے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسے خود خیال ہونا چاہیئے کہ چڑچڑے پن سے فائدہ کیا ہے۔ جلنے اور کڑھنے سے خون کم ہوتا ہے۔ اور.....

کلثوم : اب چھوڑ یئے اس ذکر کو۔ یہ کہیئے دوا شروع کب کرنا ہے؟

احمد : ایک بجے۔ امید ہے کافی فائدہ پہنچے گا اس سے۔

کلثوم : انشاء اللہ۔ ہاں بھائی جان! اب آپ یہاں رہیں گے نا؟ ذرا باورچی خانے میں جاتی ہوں۔

احمد : جاؤ میں ٹھہروں گا یہاں۔ کوئی کام نہیں ہے آج۔

(کلثوم دودھ والا گلاس لے کر کمرے سے نکل جاتی
ہے۔ احمد پلنگ کے پاس کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

ہاں صفو!

صفیہ: (دوسری طرف دیکھتے ہوئے) کیا ہے؟

احمد: (مسکراکر) آج پھر وعدہ کیا ہے تم نے کلثوم سے۔ اس کی تو ہر بات مان لیتی ہو ہماری سنتی ہی نہیں۔

صفیہ: کیا سنوں؟

احمد: میں نے کئی بار کہا ہے صفو خوش رہا کرو۔ مگر تم نے کبھی اس کا وعدہ نہیں کیا کلثوم سے جھٹ وعدہ کر لیتی ہو، چلو یہ بھی اچھا ہے کوئی شخص ایسا ہے تو سہی جس کی بات مان لیتی ہو۔

صفیہ: پھر کیا کروں؟

احمد: گویا مجبور ہو کر وعدہ کیا ہے۔

صفیہ: مجبوری کیا ہو گی ——

احمد: (صفیہ کو غور سے دیکھتے ہوئے) دیکھو صفو! کسی بات پر پریشان ہو تو کہہ دو۔ کسی چیز کو چھپانا درست نہیں۔ ممکن ہے —— ممکن کیا یقیناً تکلیف بڑھ جائیگی۔

صفیہ: کہہ جو دیا ایک بار کہ اب پہلا سا حال نہیں رہے گا۔

احمد: تم کچھ چھپا رہی ہو۔

صفیہ: خدا کے لئے یہ ذکر چھوڑ دو۔ خود بھی پریشان ہوتے ہو اور مجھے بھی پریشان کرتے ہو خواہ مخواہ!

احمد: آخر یہ کیا مصیبت ہے! کوئی تکلیف ہے تو بتاتی کیوں نہیں ہو؟

صفیہ: گفتگو کے لئے کوئی اور موضوع باقی نہیں ہے کیا؟

احمد: مجھے یقین سا ہو رہا ہے جیسے تم کچھ چھپا رہی ہو — تمہارے دل میں ——

صفیہ: (تنک کر) میرے دل میں دکھ ہے سب کچھ جانتی ہوں پر سینے پر پتھر لئے بیٹھی ہوں — ہونٹ سی رکھے ہیں! — یہی سننا چاہتے تھے نا —— اب کہو

احمد: (حیران ہو کر) میں پہلے ہی سمجھتا تھا۔ پر ایسا ہوا کیوں ہے —— ایسا ہو کیوں رہا ہے۔

آخر تمہیں تکلیف کس بات کی ہے، کیا وجہ ہے اس کی؟

صفیہ: وجہ؟ اوہ!

احمد: صفو!

صفیہ: اس کی وجہ تمہاری منافقت ہے۔ تمہارے ظاہر اور باطن میں فرق ہے۔ مجھ سے یہ الفاظ سن کر حیران ہو گئے ہو، مگر تم نے خود ہی یہ موضوع چھیڑا ہے۔ تمہیں نے میرے زخم پر ہاتھ لگایا ہے۔ میں تو خاموش تھی۔ اب تک خاموش رہی تھی پر ـــــ

احمد: میری منافقت میرے ظاہر اور باطن میں فرق۔ صفو! یہ تم کیا کر رہی ہو!

صفیہ: میں پاگل نہیں ہوں، جو کچھ کہا ہے، میں نے پوری ذمہ داری کے ساتھ کہا ہے۔ میں نے اس صدمے کو اپنے دل میں دبا رکھا تھا۔ اپنے ہونٹ سی لئے تھے آج تم نے کرید کرید کر پوچھا تو حقیقت کا اظہار کرنے پر مجبور ہو گئی۔

احمد: صفو! تم نے مجھ پر بہت بڑا الزام لگایا ہے ـــ معلوم ہوتا ہے کسی بہت بڑی خوفناک غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی ہو۔

صفیہ: یہ غلط فہمی نہیں ہے ـــ کاش غلط فہمی ہوتی

احمد: جو کچھ تمہارے دل میں ہے آج اُگل دو۔ میں سب کچھ بڑے اطمینان کے ساتھ سنوں گا۔ تمہارے پاس اس امر کا ثبوت کیا ہے کہ میں منافق ہوں میرے ظاہر اور باطن میں فرق ہے؟

صفیہ: یہ غزالہ کون ہے؟

احمد: (ایک دم چونک کر) کون کیا کہا تم نے ـــ غزالہ ـــ

صفیہ: ہاں غزالہ ـــ جس کا خط تم نے نہایت حفاظت سے مقفل الماری کے ایک گوشے میں رکھا ہوا تھا۔ تمہیں یقین تھا اس پر کبھی کسی کی نظر نہیں پڑے گی۔ یہ دیکھو (تکیے کے نیچے سے خط نکال کر) کیا تم انکار کر سکتے ہو یہ خط غزالہ کا نہیں ہے، اور تمہیں مخاطب کر کے نہیں لکھا گیا؟

احمد: مجھے اس امر سے انکار نہیں ہے کہ یہ خط غزالہ کا ہے۔ لیکن ـــــ

صفیہ: لیکن کیا — کیا اس خط کے تم مخاطب نہیں ہو؟

احمد: یہ بھی درست ہے، مگر میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ جس کی بنا پر تم اس طرح بدگمان ہو جاؤ۔ خط رومانی انداز میں لکھا گیا ہے۔ شروع سے آخر تک میری پینٹنگ کی تعریف ہے۔ اس کے علاوہ اور کیا ہے اس میں؟

تم خواہ مخواہ بگڑ رہی ہو! کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم جیسی ہوش مند عورت بھی ایک نہایت معمولی بات پر جذباتی رَو میں یوں بہنے لگے اور اپنی زندگی میں تلخی پیدا کر لے — دکھاؤ خط، میں تمہیں پڑھ کر سناتا ہوں (صفیہ کے ہاتھ سے خط لے کر) غور سے سنو —

"احمد صاحب! میں نہیں جانتی آپ کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ آپ کی تصویر نے میرے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے اور میں آپ کو خط لکھنے پر مجبور ہو گئی ہوں — اس کے بعد تصویر کی لمبی چوڑی تعریف ہے — اس کے علاوہ اور بھی کچھ ہے اس میں — بتاؤ

(خط پلنگ کے ایک طرف رکھ دیتا ہے)

صفیہ: اور آخر میں کیا ہے؟

احمد: آخر میں؟ آخر میں خط و کتابت جاری رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا ہے مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ خط و کتابت ہو ہی نہیں سکی۔ غزالہ کے اس خط کے علاوہ مجھے اور کوئی خط نہیں ملا۔

صفیہ: شروع میں اسی قسم کا خط لکھا جاتا ہے اس کے بعد کتنے خط آئے — کیا کچھ ہوتا رہا — اس کے متعلق میں کیا جانوں؟

احمد: مگر صفو! میں نے تمہیں بتایا جو ہے کہ مجھے غزالہ کا صرف یہی خط ملا تھا — — صرف یہی ایک خط!

صفیہ: میں کیونکر یقین کر لوں کہ اس کے بعد اور خط نہیں آئے؟

احمد: اور خط آتے تو تمہیں ضرور مل جاتے۔

صفیہ : یہ خط اتفاقاً مل گیا ہے۔ دوسرے خطوں کے بارے میں میں کیا جانوں

نہ جانے تم نے کہاں چھپا رکھے ہیں ـــــ یہاں ہیں بھی یا نہیں۔

احمد : مجھے اور کوئی خط نہیں ملا تھا

صفیہ : اس کا ثبوت ؟

احمد : اس کا ثبوت ؟ اس کا ثبوت صرف یہی دے سکتا ہوں کہ اور کوئی خط میرے پاس نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تم نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ ہمارے تعلقات ہمیشہ اچھے رہے ہیں، تمہیں مجھ سے اور مجھے تم سے کبھی شکایت کا موقعہ نہیں ملا!

صفیہ : اس میں شک نہیں کہ حالات کی ظاہری سطح پر ہم ہمیشہ خوش رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر مسکراتے رہے ہیں، لیکن زندگی کی ایک اور سطح بھی ہوتی ہے جو ظاہری سطح سے مختلف ہوتی ہے۔ اور یہاں وہی کچھ نہیں ہوتا جو آنکھوں اور ہونٹوں میں ہوتا ہے، جو ظاہری پیار اور محبت میں ہوتا ہے، بلکہ یہاں دل کی گہرائیوں میں جھانکا جاتا ہے ـــ ایک دوسرے کے سینے کو ٹٹولا جاتا ہے، اور مجھے یقین ہو چکا ہے کہ تمہارے دل کی گہرائیوں میں ایک اور عورت بھی سانس لے رہی ہے جس کا نام غزالہ ہے۔

احمد : اس معمولی سے خط کو دیکھ کر تم اتنے بڑے وہم میں مبتلا ہو گئی ہو۔ حیرت ہے!

صفیہ : خط کے علاوہ اور بھی ثبوت ہیں میرے پاس۔

احمد : مثلاً کیا؟

صفیہ : میں نے اس تحریر کو کچھ اہمیت نہیں دی تھی مگر ایک دن میرے ہاں چند سہیلیاں آئی تھیں۔ تم نے باہر سے آکر پوچھا تھا، کون کون آیا ہے۔ یاد ہے یہ بات؟ شاید بھول گئے ہو، خیر میں نے یونہی کہہ دیا، ایک نئی سہیلی بھی آئی ہے جس کا نام غزالہ ہے یہ لفظ سنتے ہی تمہاری آنکھوں میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو گئی تھی، یہ پہلا موقعہ

تھا کہ میرے ذہن میں ایک شبہے نے سر اٹھایا۔ پھر بھی میں نے کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا ـــ لیکن ایک دن تو تم نے کمال کر دیا۔ میں نئی ساڑھی پہن کر سینما جانے کے لئے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تم آئے اور کہنے لگے۔ آج تو تم ایک مصوّر کا خواب بن گئی ہو ـــ ہر عورت اپنے حسن و جمال کی تعریف سن کر خوش ہوتی ہے مجھے بھی خوشی ہوئی ـــ اور بہت خوشی ہوئی۔

احمد: مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔

صفیہ: پھر تم نے کہا تھا ـــ آئندہ میں تمہیں غزالہ کہا کروں گا۔

احمد: یاد آیا ـــ میں نے کہا تھا۔

صفیہ: میری پیشانی پر بل دیکھ کر تم نے اندازہ لگا لیا کہ میں غزالہ وزالہ کہلانا پسند نہیں کرتی اس لئے تم نے اس وقت کہہ دیا۔ اچھا تمہیں غزالہ کہلانا پسند نہیں تو میں نہ کہونگا۔ مگر تیر کمان سے چھوٹ چکا تھا اور میں سمجھ چکی تھی کہ حقیقت کیا ہے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میرا شبہ غلط نہیں ہے ـــ تم واقعی غزالہ کو چاہ رہے ہو، چوری چوری، چھپ چھپ کر، اس کے علاوہ اور کیا ثبوت چاہئیں تمہیں ـــ؟ جب میرے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا تو میں دل ہی دل میں کڑھنے لگی۔ کہ غزالہ ہر جگہ موجود ہے اس گھر میں بھی موجود ہے تم اس سے ملتے ہو، اس سے باتیں کرتے ہو اور مجھے صرف ایک کھلونا سمجھ کر کھیل رہے ہو، میری اپنی کوئی شخصیت نہیں ہے۔ یہاں غزالہ ہی غزالہ ہے جو تمہارے دل میں ہے، جو تمہارے دماغ میں ہے جو ہر وقت تمہارے سامنے ہے۔ میں نے خاموش رہنا چاہا۔ لیکن رہ نہ سکی زندگی کی ندی بظاہر بڑے سکون سے بہے جا رہی تھی مگر اس کی تہ میں ایک ایسا طوفان برپا ہو گیا تھا جس کی لہروں کو دبائے رکھنا میرے اختیار سے باہر تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری ساری شگفتگی ختم ہو گئی۔ میں چڑچڑی ہو گئی۔ میرے لہو میں زہر پیدا ہو گیا اور ـــ

احمد: صفو! جو کچھ ہوا مجھے اس کا بے حد افسوس ہے مگر میں پورے خلوص کے ساتھ

تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے آج تک غزالہ کو نہیں دیکھا۔ اگرچہ دیکھنے کی ہمیشہ آرزو رہی۔ اور یہ اس کا پہلا اور آخری خط ہے ــــ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ اس نام کی عورت رہتی کہاں ہے۔ تم نے اس خط میں دیکھا ہوگا، نیچے صرف غزالہ لکھا ہوا ہے۔ پتہ درج نہیں۔ اب خدارا اس وہم کو دل سے نکال دو۔

صفیہ: کیسے نکال دوں۔ یہ وہم نہیں حقیقت ہے۔ اور حقیقت یوں دل سے نہیں نکالی جا سکتی۔

احمد: میں نے جو کچھ کہا ہے درست ہے۔ اس میں ذرہ برابر جھوٹ نہیں۔

صفیہ: میں کوئی بچی نہیں جو ایسی باتوں سے بہل جاؤں گی ــــ اب بھی جھوٹ کہہ رہے ہو۔ اور اس طرح کہہ رہے ہو جیسے میں فوراً اعتبار کر لوں گی تمہاری بات پر کیا معصومیت ہے!

احمد: یہ جھوٹ ہرگز نہیں۔

صفیہ: میں خوب سمجھتی ہوں، تم مجھے بدستور فریب میں مبتلا رکھنا چاہتے ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ اب نہیں ہو سکے گا۔

احمد: تو خود ہی بتاؤ کس طرح یقین دلاؤں تمہیں کہ یہ صرف تمہارا وہم ہے۔ میں اصل واقعہ سنا دیتا ہوں ــــ واقعہ یہ ہے۔

صفیہ: میں کچھ نہیں جانتی، کتنی سادگی سے کہا جا رہا ہے میں نے آج تک غزالہ کو دیکھا ہی نہیں۔ اس خط کے سوا مجھے اس کا کوئی اور خط ملا ہی نہیں۔ تو یہ کتنا خطرناک دھوکا ہے کتنا زبردست فریب۔

احمد: (غصّے سے) تم کچھ سمجھتی ہی نہیں ہو۔ یہ جھوٹ نہیں ہے۔ کم از کم وہ واقعہ ہی سن لو۔ پھر کہنا یہ جھوٹ ہے یا دھوکا ہے۔

صفیہ: (اسی طرح غصّے سے)، یہ جھوٹ ہے، یہ دھوکا ہے خدا کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دو۔ بولتے بولتے میرا دماغ تھک چکا ہے۔ میں نڈھال ہو چکی ہوں۔

احمد : دیکھو صفو!

صفیہ : نہیں۔ خدا کے لئے نہیں، میں چلی جاتی ہوں (پلنگ سے اٹھ بیٹھتی ہے)

احمد : مگر صفو! ٹھہرو، بات سنو میری، چلیں کہاں (راستہ روکنا چاہتا ہے کہ باہر سے کلثوم کی آواز "بھائی جان" کہتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ احمد راستہ چھوڑ دیتا ہے۔ صفیہ دروازے سے نکل جاتی ہے)

(احمد وہیں کھڑا ہے، کلثوم آتی ہے)

کلثوم : میں نے کہا بھائی جان؟ کھانا تیار ہو گیا ہے۔ ارے یہ صفیہ کہاں گئی؟ اور آپ ——

احمد : ٹھہر کر کھا لوں گا ——

کلثوم : آپ — کیا ہوا ہے؟

احمد : ہونا کیا ہے؟ کچھ نہیں۔

کلثوم : پھر بھی — بھائی جان؟

(احمد خاموش رہتا ہے)

کیا ہوا آخر؟ کوئی تلخ بات کہہ دی صفیہ نے؟ آپ کو یہ تو سوچنا چاہیئے کہ وہ بیمار ہے بیماری میں آدمی تنک مزاج ہو ہی جاتا ہے۔

احمد : (کلثوم کو غور سے دیکھ کر) کلثوم!

کلثوم : جی!

احمد : مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے — تم بگڑی ہوئی صورتِ حال بدل سکتی ہو۔

کلثوم : میں کچھ سمجھی نہیں بھائی جان!

احمد : صفیہ کے دل میں ایک وہم پیدا ہو گیا ہے۔ میں نے اسے دور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن نہیں کر سکا۔ تم چاہو تو کر سکتی ہو۔ اور میں جانتا ہوں تم میری اور صفو کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھو گی۔

کلثوم: (حیران ہو کر) یہ معمہ کیا ہے؟

احمد: ابھی تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

کلثوم: تو کہیئے۔

احمد: میں تمہیں اصل واقعہ سناتا ہوں۔ شاید تمہیں خبر نہیں کہ شادی سے پہلے مجھے مصوری کا بے حد شوق تھا، بلکہ جنون تھا۔ میری بنائی ہوئی بہت سی تصویریں اخباروں اور رسالوں میں بھی چھپ چکی تھیں۔ انہی دنوں میں نے نمائش کے لئے ایک تصویر بنائی تھی، یہ تصویر نمائش گاہ میں رکھی گئی اور بہت مقبول ہوئی، چند روز کے بعد مجھے نمائش گاہ کے مہتمم کی معرفت ایک خط ملا۔ یہ کسی لڑکی کی طرف سے تھا۔ اس خط میں بڑے رومانی انداز میں میری تصویر کی تعریف تھی۔ اور خط و کتابت جاری رکھنے کی خواہش کا اظہار تھا۔

کلثوم: کون تھی وہ؟

احمد: خط کے نیچے صرف غزالہ لکھا تھا۔

کلثوم: کیا؟

احمد: غزالہ!

کلثوم: (حیرت سے) عجیب نام ہے۔

احمد: اس خط نے مجھے بہت متاثر کیا۔ دراصل اس زمانے میں میں خود بڑے عجیب موڈ میں تھا۔ محبت کرنے اور کسی کو پرستیدہ خیال بنانے کے موڈ میں۔ اس حالت میں اچانک ایک لڑکی کا خط مل گیا۔ خوشبو میں لپٹا ہوا خط، اور پھر نام غزالہ، میرے ذہن میں ایک تلاطم برپا ہو گیا، میں سوچنے لگا —— خیر میں نے بہت کچھ سوچا، مگر جو کچھ سوچا اسے عمل میں نہ لا سکا۔ وجہ یہ تھی کہ خط کے نیچے صرف غزالہ لکھا تھا اس کا پتہ درج نہیں تھا

کلثوم: کیا؟

احمد: پتے کے بغیر کیونکر جواب لکھ سکتا تھا۔ اور اس نے بھی کوئی اور خط نہ لکھا میں نے

ہر چند اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی، لیکن بے سود، نمائش گاہ میں اپنی تصویر کے پاس کھڑا رہتا تھا کہ وہ کسی دن وہاں آجائے اور ملاقات کا موقعہ نکل آئے۔ پر اس کا کچھ پتہ نہ مل سکا۔ اس کا پہلا اور آخری خط میرے پاس محفوظ تھا۔ میں نے اس کو بڑی حفاظت کے ساتھ الماری کے ایک گوشے میں رکھا ہوا تھا۔ اور کبھی کبھی تنہائی میں پڑھ لیا کرتا تھا۔ نہ جانے کس طرح یہ خط صفو کے ہاتھ آگیا۔ کسی چیز کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کی نظر وہاں پڑ گئی ہوگی۔ اس خط کے بعد اس کے ذہن میں ——— یہ وہم پیدا ہو گیا کہ میں اب تک غزالہ سے محبت کر رہا ہوں، اور اکثر اس سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ حالانکہ جہاں تک ملاقات کا تعلق ہے اس میں ذرہ بھر صداقت نہیں!

کلثوم: اور؟

احمد: اور کیا! تمہاری مراد محبت سے ہے، بھئی اس زمانے میں یہ غزالہ میری نظروں میں ایک مثالی عورت بن کر رہ گئی تھی۔ اور میں نے اس کے متعلق بہت کچھ سوچا تھا۔ بہت سے خواب دیکھے تھے۔ اگر اس نے اپنے خط میں پتہ لکھ دیا ہوتا تو ممکن تھا یہ خواب حقیقت سے دور نہ رہتا، اور میں نے جو کچھ سوچا تھا وہی ہو جاتا۔

کلثوم: تو ———

احمد: میرے تصورات زندگی کے نئے ہنگاموں میں دب کر رہ گئے اور اب دل میں صرف کسک سی باقی رہ گئی ہے۔ یہ بھی آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ اسے دیکھنے کی کوئی امید باقی نہیں ہے اور امید ہو بھی کیونکر سکتی ہے۔ (ایک دو لمحہ خاموش رہ کر) یہ اس کا پہلا اور آخری خط ہے۔

(احمد پلنگ سے خط اٹھا کر کلثوم کو دیتا ہے کلثوم اسے سرسری نظر سے دیکھتی ہے اور پھر تپائی پر رکھ دیتی ہے)

یہ ہے سارا واقعہ ——— یہی واقعہ صفو کو بھی بتا دینا چاہتا تھا۔ پر غم و غصہ میں اس نے ایک لفظ بھی سننا پسند نہ کیا۔ تم اسے حقیقت بتا سکتی ہو۔

کیوں کلثوم! یہ کوئی مشکل معاملہ نہیں ہے ــــ یوں خاموش کیوں ہو، سوچ کیا رہی ہو؟

کلثوم: کچھ نہیں ــــ کچھ بھی تو نہیں!

احمد: کچھ تو سوچ رہی ہو۔ اپنی بہن کی طرح کیا تمہارا ابھی یہ خیال ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟

کلثوم: مجھے یقین ہے آپ نے جو کچھ کہا ہے درست ہے۔

احمد: تو پھر اسے بھی یقین دلا دو۔

کلثوم: یقین دلا دوں ــــ کیونکر؟

احمد: تم جو کچھ کہو گی وہ اس پر یقین کرلے گی۔

کلثوم: یہ درست ہے ــــ مگر بھائی جان! ایسے معاملے میں میرا دخل دینا اچھا معلوم نہیں ہوتا ــــ یہ مناسب نہیں ہے ــــ میں

مجھے معاف کیجئے۔

احمد: آخر کیوں؟

کلثوم: مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں ــــ (خاموش رہتی ہے)

احمد: ڈر کیوں لگتا ہے۔ اسے تم پر پورا پورا اعتبار ہے۔

کلثوم: ممکن ہے کہ اس معاملے میں مجھ پر اعتبار نہ کرے۔ اس قسم کے معاملات بہت نازک ہوتے ہیں۔ آپ خود ہی سمجھائیں۔

احمد: میں تو اپنی طرف سے انتہائی کوشش کر چکا ہوں۔

کلثوم: اس وقت اس کا ذہن مضطرب ہے۔ چند روز توقف کیجئے جب قدرے سکون پیدا ہو جائے تو کہیئے۔

احمد: سکون پیدا ہو گا یا حالات اور زیادہ خراب ہو جائیں گے۔ شاید تم بھی کچھ بدگمان ہو گئی ہو۔

کلثوم: یہ بات بالکل نہیں۔
احمد: تو وجہ کیا ہے پھر؟
کلثوم: وجہ ——؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔
احمد: (جلدی سے) کلثوم! تم نے ابھی حالات کی نزاکت کا انداز نہیں لگایا۔ جو بہت بگڑ چکے ہیں۔ اس کی بیماری کی اصل وجہ بھی یہی ہے۔ اگر فوراً اس کے وہم کو دور نہ کیا گیا تو وہ بدستور کڑھتی رہے گی اور اس سے بیماری بڑھ جائے گی۔
کلثوم: (سوچ میں ڈوبی ہوئی) اچھا!
احمد: بس ٹھیک ہے۔ میں اسے بھیج دیتا ہوں یہیں۔

(احمد کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ کلثوم کمرے میں ٹہلنے لگتی ہے۔ یکایک اس کی نظر خط پر پڑتی ہے۔ اسے اٹھا کر دیکھتی ہے۔ جھک کر اس کا آخری حصہ دیکھتی ہے۔ یکایک باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے.... صفیہ آتی ہے....)

صفیہ: کیا ہے کلثوم! بلایا کیوں ہے مجھے؟
کلثوم: کچھ کہنا ہے تم سے۔
صفیہ: کہو!
کلثوم: اطمینان سے بیٹھو تو سہی (صفیہ کو اس پلنگ پر بٹھا دیتی ہے) ہاں اس طرح —— اب سنو۔ بھائی جان نے سارا واقعہ سنا دیا ہے مجھے۔ وہ شادی سے پہلے بہت اچھے مصور تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے ایک بہت خوبصورت تصویر بنائی تھی۔ جو نمائش گاہ میں رکھی گئی تھی۔ یہ تصویر دیکھ کر ایک لڑکی بہت متاثر ہوئی، اور اس نے ایک خط لکھ دیا احمد مصور کو نمائش گاہ کے مہتمم کی وساطت سے —— یہ ڈرامہ یہیں پر ختم ہو گیا۔ کیونکہ نہ تو خط لکھنے والی غزالہ مصور کو دیکھ سکی۔ اور نہ مصور غزالہ کو۔

صفیہ: خط وکتابت تو ہوئی ہوگی؟

کلثوم: نہیں خط وکتابت نہیں ہو سکی۔ کیونکہ غزالہ نے اپنا پتہ خط میں نہیں لکھا تھا۔

(احمد دبے پاؤں آتا ہے اور چپ چاپ ایک طرف اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے کہ دونوں کی نظر اس پر نہیں پڑتی۔)

صفیہ: پتہ دوسرے خط میں لکھ دیا ہوگا۔

کلثوم: دوسرے خط تک نوبت ہی نہیں پہنچی تھی ——— بھائی جان کیونکر جواب دیتے پتہ درج نہیں تھا۔

صفیہ: تم سمجھتی ہو یہ درست ہے؟

کلثوم: بالکل!

صفیہ: اور یہ غزالہ ——— ؟

کلثوم: (جلدی سے) یہ غزالہ ——— میں کیا جانوں کون تھی۔ ہوگی شاعرانہ مزاج رکھنے والی لڑکی۔ دنیا میں ایسے جذباتی انسانوں کی کمی نہیں ہے، جو دوسروں کو دیکھے بغیر ان کے متعلق عجیب وغریب رائیں قائم کر لیتے ہیں اور پھر عجیب وغریب توقعات کے ساتھ خط لکھ دیتے ہیں ——— غزالہ کے معاملے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ اس کا اصلی نام نہیں ہوگا۔ اس نے احتیاطاً ایک فرضی نام کے پردے میں مصور کو خط لکھا ہوگا۔ مگر خط میں پتہ لکھنا بھول گئی ہوگی ——— جب مصور کی طرف سے پہلے خط کی رسید تک نہ پہنچی ہوگی تو وہ مایوس ہو گئی ہوگی۔ اور پھر اپنی توہین محسوس کر کے دوسرا خط نہ لکھا ہوگا۔ حالانکہ غلطی اس کی اپنی تھی۔ اس طرح یہ ڈرامہ آغاز ہی میں ختم ہو گیا۔

صفیہ: شاید یہی حقیقت ہو۔

کلثوم: شاید کیا بالکل یہی حقیقت ہے۔

احمد: (ہنس کر) اور دوسری حقیقت یہ ہے کہ اب صفیہ کے دل ——— سے وہم دور

ہو گیا ہے۔

کلثوم: ارے ــــــ آپ یہاں کھڑے تھے۔ توبہ ہے بھائی جان! ہمیں آپ کی آمد کا علم ہی نہ ہو سکا۔

احمد: چھپ کر کھڑا تھا۔ خدا کا شکر ہے ہمارے ڈرامے کا انجام بخیر ہوا، اسے کہتے ہیں کامیڈی۔ کیوں صفو!

(صفیہ جواب نہیں دیتی)

کلثوم: رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت!

احمد: چلیں کہاں تم کلثوم؟

کلثوم: بس میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے (ہنس کر) اب آپ جانیں اور آپ کی بیگم صاحبہ!

(کلثوم کمرے سے نکل جاتی ہے)

احمد: ٹھیک ہی تو کہا ہے تمہاری بہن نے "رسیدہ بود بلائے ولے ــــــ کیوں صفو؟

صفیہ: عجیب معاملہ ہے۔

احمد: (گھبرا کر) کیا ابھی معاملے میں کوئی عجیب بات باقی ہے؟

صفیہ: خیر ــــــ چھوڑو!

احمد: پھر بھی کہہ دو نا صاف صاف۔

صفیہ: کلثوم اس طرح باتیں کر رہی تھی جیسے ــــــ

احمد: جیسے وہ غزالہ کو جانتی ہو جیسے اس معاملے کا اسے علم ہو ــــــ ہو سکتا ہے کہ ــــــ

صفیہ: (الفاظ کاٹ کر) کیا؟

احمد: یہی کہ تمہاری یہ بہن غزالہ کو جانتی ہو ــــــ اس کی سہیلی ہو۔

صفیہ: کتنی حسرت تھی اس کی آنکھوں میں —— جیسے اسے خود بڑا افسوس ہو پتہ نہ لکھنے کا۔

(رحیمن آتی ہے)

رحیمن: میاں جی کھانا یہیں لے آؤں؟

صفیہ: کلثوم کیا کر رہی ہے؟

رحیمن: وہ تو چلی گئیں۔

صفیہ اور احمد: (ایک ساتھ) چلی گئیں؟

رحیمن: جی:

(دونوں ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے ہیں۔
پردہ تیزی سے گرتا ہے)

دیوار

کردار

اختر...............
جیواں..............
نیّر...............
فیضی..............

منظر

ایک خاص کمرہ، عمدہ اور خوبصورت فرنیچر سے آراستہ۔ فرش پر قالین۔ دیواروں پر رنگ برنگ تصویریں۔ دروازے اور کھڑکیوں پر ریشمی پردے کمرے کے سجانے میں کافی اہتمام کیا گیا ہے اور اس سے بڑے اچھے اور ترقی یافتہ ذوق کا ثبوت ملتا ہے۔ جنوبی دیوار میں آنے جانے کے لئے ایک دروازہ جو ملحقہ کمرے میں کھلتا ہے۔ دروازے کے سامنے شمالی دیوار کے قریب سنگار میز۔

موسمِ بہار کی ایک شام۔ وقت تین بجے۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو سنگار میز کے پاس اختر بیٹھی ہوئی میک آپ میں مصروف نظر آتی ہے۔ اختر کا سن سولہ سترہ کا ہوگا۔ وہ چھریرے بدن کی ایک خوبصورت لڑکی ہے، چہرے پر پاؤڈر لگاتے ہوئے دھیمے سُروں میں گا رہی ہے:

"وہی مجھ کو عیشِ دوام ہے جو کرے تو ایک نظر سے خوش۔"

جیداں آتی ہے — جیداں ادھیڑ عمر کی نوکرانی ہے۔ ایک ہاتھ میں چائے کی پیالی، دوسرے میں بسکٹوں والی طشت،

جیواں: لو بی بی! اب تو پی لو چائے (پیالی سنگار میز پر رکھ دیتی ہے اور طشت بھی رکھنے لگتی ہے)

اختر: (مصنوعی غصے سے) بڑا تنگ کرتی ہے تو مائی۔ پیالی سنگار میز پر رکھ دی ہے۔ اگر الٹ جائے تو ساری چیزوں کا ستیاناس ہو جائے۔ مجھے تو ان سے نفرت ہے مائی نفرت۔

جیواں: کن سے نفرت بی بی؟

اختر: انہی چیزوں سے، سنگار میز کے اوپر جو ہیں۔

جیواں: ناں بی بی!

اختر: انہیں الٹ پلٹ جو کرتی رہتی ہے تو۔

جیواں: میں تو ہاتھ بھی نہیں لگاتی انہیں۔

اختر: تو کس نے چھیڑا ہے میری چیزوں کو؟

جیواں: بڑی بی بی نے کہہ رکھا ہے، اختر کی چیزوں کی میں خود دیکھ بھال کیا کروں گی۔ اور وہ خود ہی صفائی کرتی ہیں۔

اختر: اور یہ سنگار میز؟ (چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں)

جیواں: صبح وہی ادھر صفائی کر رہی تھیں۔

اختر: (جلدی سے میز کی دراز کھول کر) دراز بھی کھولی ہو گی انہوں نے ــــ ہیں ــــ؟

جیواں: میں کیا جانوں بی بی!

اختر: میں اس وقت کہاں تھی؟

جیواں: آپ کالج جا چکی تھیں۔

اختر: (دراز میں کوئی چیز تلاش کرتے ہوئے، توبہ، باجی کو بھی نہ جانے کیا ہو گیا ہے!

جیواں: کیسی باتیں کرتی ہو بی بی! وہ تو جان دیتی ہیں تم پر۔ کسی ماں کو بھی اپنی اکلوتی بیٹی سے اتنا پیار کہاں ہو گا جتنا انہیں تم سے ہے۔

اختر: یہ ٹھیک ہے پر ——— ہائے اللہ! کہاں غائب ہو گئی وہ ———

جیواں: کیا ڈھونڈ رہی ہو؟

اختر: تمہیں کیا ——— ہائے کہیں بھی نہیں۔ باجی لے گئی ہوں گی۔ تو نے ان کے ہاتھ میں نیلے رنگ کی ایک کاپی دیکھی تھی؟

جیواں: نہیں۔ میں نے تو نہیں دیکھی۔ ادھر اپنی کتابوں کی الماری میں رکھ دی ہو گی تم نے۔ لو بابا اب چائے تو پی لو۔ دوسری مرتبہ گرم کر کے لا رہی ہوں۔

اختر: میں کاپی ڈھونڈ رہی ہوں اور تجھے چائے کی پڑی ہے ——— لے جاؤ میں نہیں پیتی دیتی۔

جیواں: کاپی نہیں ملتی تو اس میں میرا کیا قصور؟

اختر: جا ادھر دیکھ کر آ باجی کیا کر رہی ہیں!

جیواں: میں آئی تھی تو کچھ پڑھ رہی تھیں۔

اختر: (رسٹ واچ پر نظر ڈال کر) تین بج گئے۔

(لپ سٹک ہونٹوں پر لگانے لگتی ہے، یکایک کچھ خیال آتا ہے اور دراز کی چیزیں اور سامانِ آرائش باہر نکالنے لگتی ہے)

جیواں: اس طرح تیاری کرتی رہیں تو تین بجے نہیں جا سکو گی بی بی چائے ویسی کی ویسی پڑی ہے۔

اختر: (غصے سے) میں کیا کروں؟

(نیر آتی ہے۔ عمر تیس کے لگ بھگ، دراز قد، آنکھوں پر عینک، صحت اچھی۔ آہستہ آہستہ اختر کی طرف آتی ہے۔ اختر کی اس پر نظر نہیں پڑی، وہ دراز کی چیزیں باہر نکال رہی ہے)

نیر: کیا ہے اختر؟

اختر: (گھبرا کر) اوہ —— باجی! کچھ نہیں۔
نیر: اتنی پریشان کیوں ہو؟
اختر: نہیں تو —— باجی!
نیر: (مسکرا کر) کوئی چیز گم ہو گئی ہے کیا؟
اختر: جی ہاں —— نہیں باجی!
نیر: جیواں! دیکھو ادھر میرے کمرے میں میز کے اوپر ایک نیلے رنگ کی کاپی پڑی ہے، لے آؤ جا کر۔
جیواں: اچھا!

(نیر مسکرا رہی ہے۔ اختر دانتوں سے نچلا ہونٹ دبا رہی ہے۔)

نیر: یہ سجاد کون ہے؟
اختر: کلاس فیلو ہے باجی! شاعر ہے، نظمیں پڑھنے کے لئے لائی تھی کاپی۔

(جیواں کاپی لے کر آتی ہے)

نیر: (جیواں کے ہاتھ سے کاپی لے کر) بڑے اچھے شعر لکھتا ہے۔ ساری نظمیں پڑھ ڈالی ہیں میں نے۔
اختر: جی ہاں —— وہ —— رسالوں میں بھی اس کی نظمیں چھپتی ہیں۔
نیر: مجھے بہت پسند آئی ہیں (اختر کو کاپی دے کر) بھئی کہاں جانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ کالج میں کوئی کنسرٹ ہے؟
اختر: جی نہیں کالج میں کنسرٹ ہے۔
نیر: (ہنس کر) معلوم ہوتا ہے کچھ پریشان ہو۔ کہیں دیر تو نہیں ہو گئی۔ کب جانا ہے وہاں؟
اختر: (رسٹ واچ دیکھ کر) تین بجے۔
نیر: تین تو بج گئے۔ اور یہ چائے ابھی یہیں پڑی ہے۔

جیواں: میں تو دوسری مرتبہ گرم کر کے لائی ہوں بی بی۔

نیّر: ایک مرتبہ اور گرم کر لا۔ ٹھنڈی ہو گئی ہو گی۔

جیواں: گرماتی ہوں بی بی۔

(جیواں چائے کی پیالی اٹھا کر باہر چلی جاتی ہے)

نیّر: اکیلی جاؤ گی اختر؟

اختر: آپ کہتی ہیں تو نہیں جاتی۔

نیّر: میں نے کب کہا اکیلی نہ جاؤ (پیار سے بہن کے شانے پر ہاتھ رکھ کر) عجیب لڑکی ہے میری بہن۔ اکیلی جانے میں کیا برائی ہے۔ پہلے بھی کئی مرتبہ جا چکی ہے۔ آج بھی چلی جا۔

(جیواں پیالی لے کر آتی ہے)

جیواں: لو ہو گئی ہے گرم۔

نیّر: (جیواں کے ہاتھ سے پیالی لے کر اختر کو دیتے ہوئے) اطمینان کے ساتھ پیو اختر، کنسرٹ ہی تو ہے۔ دس پندرہ منٹ لیٹ ہو جاؤ گی تو کیا حرج ہے۔ واپس کب آؤ گی؟

اختر: جلدی آ جاؤں گی ——— چھ سے پہلے

نیّر: اختر تیار ہو جائے تو تانگہ لے آنا جیواں۔

جیواں: اچھا بی بی!

(نیّر کمرے سے نکل جاتی ہے۔ اختر چائے کے دو تین گھونٹ جلدی جلدی حلق میں انڈیلتی ہے۔ اس کی نظر کاپی پر جمی ہے جو اس کے سامنے میز پر پڑی ہے)

اختر: (اپنے خیال میں) نہ جانے باجی نے کیا سوچا ہو گا۔

جیواں: (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) کیا؟

اختر : (غصّے سے) کچھ نہیں ہر ایک بات پر پوچھتی ہے ــــ کیا ؟ کیا؟؟

جیواں : میں کچھ نہیں پوچھتی بچی ! بسکٹ تو کھا لے۔ نہ جانے کب وہاں سے لوٹے گی۔
اب لے آؤں تانگہ، کالج جائے گی نا!

اختر : تانگہ لانے کی ضرورت نہیں۔

جیواں : (حیرت سے) کیوں ؟

(اختر جواب دیئے بغیر کاپی اٹھا کر کمرے سے نکل جاتی ہے۔
جیواں پیالی اور طشت اٹھانے لگتی ہے نیر دوبارہ آتی ہے)

نیر : چلی گئی اختر اور تانگہ ؟

جیواں : میں نے بہتیرا کہا تانگہ لا دیتی ہوں۔ بڑی بی بی مجھ پر خفا ہوں گی۔ پر چلی گئی، پیدل چلی جائے گی۔ کالج کوئی دور تو ہے نہیں۔

نیر : دیر ہو گئی ہے۔ خیر، وہ دیکھو دراز کی سب چیزیں باہر چھوڑ گئی ہے۔ مجھے پہلے ہی اس کا یقین تھا سب کچھ اسی طرح بکھرا ہوا چھوڑ جائے گی۔

جیواں : آکر درست کرتی ہوں (پیالی کی طرف اشارہ کر کے) یہ چھوڑ آؤں وہاں۔

نیر : میں خود رکھوں گی۔

جیواں : (مسکرا کر) آپ تو بی بی اختر کو بالکل ننھی بچی سمجھتی ہیں۔ بالکل ننھی بچی۔

(مسکراتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ نیر دراز کی چیزیں احتیاط سے دراز میں رکھنے لگتی ہے۔ چند لمحے گزر جاتے ہیں۔ جیواں آتی ہے)

جیواں : ایک شخص آیا ہے۔

نیر : کون ہے ؟

جیواں : کوئی گیس ہو گا۔

نیر : لے آؤ۔

(جیواں کمرے سے نکل جاتی ہے نیرؔ سنگار میز کی دراز بند کر کے اٹھ بیٹھی ہے اور کوچ کے پاس کھڑی ہو جاتی ہے جیواں کے پیچھے پیچھے فیضی کمرے میں قدم رکھتا ہے، جیسے ہی وہ داخل ہوتا ہے۔ نیرؔ ٹھٹک جاتی ہے اور جلدی سے منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے۔ جیواں فیضی کو چھوڑ کر کمرے سے نکل جاتی ہے۔ فیضی نیرؔ پر نگاہیں جمائے آگے بڑھتا ہے اور اس کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ نیرؔ مڑ کر دیکھتی ہے دونوں کی آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ فیضی ستائیس اٹھائیس برس کا ایک خوش وضع شخص ہے صحت اچھی ہے۔ درمیانہ قد اور سفید رنگ، نیرؔ کی نگاہوں میں غصہ ہے، اس کے برعکس فیضی مسکرا رہا ہے)

فیضی : نیرؔ!

(نیرؔ خاموش رہتی ہے)

بولتی کیوں نہیں ؟

نیرؔ : میرا خط مل گیا تھا ؟

فیضی : مل گیا تھا۔

نیرؔ : اس کے باوجود ــــــ

فیضی : (جلدی سے) اس کے باوجود آ گیا ہوں۔ انسان بڑا ضدی ہے نیرؔ امید کا دامن آخری دم تک نہیں چھوڑتا۔

نیرؔ : مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ خط میں لکھ چکی ہوں۔

فیضی : مگر نیرؔ : مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ ابھی تک کہا نہیں گیا۔ اس کا ایک حصہ ابھی تک میرے دل کی گہرائیوں میں ہے۔

نیرؔ : ان جذباتی باتوں کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ بہت مصروف ہوں۔

فیضی : جب آگیا ہوں تو کچھ کہے بغیر جاؤں گا نہیں، اور ظاہر ہے کچھ کہے بغیر چلے جانا

مناسب بھی نہیں۔

نیرؔ : میں خط میں سب کچھ لکھ چکی ہوں۔ کچھ اور کہنے سننے کی اب قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

فیضی : تو تم اپنی طرف سے وہ تعلق ختم کر چکی ہو جو میرے اور تمہارے درمیان کبھی تھا۔

نیرؔ : ہاں!

فیضی : نیرؔ تم ڈاکٹر ہو۔ تم سے زیادہ اس حقیقت سے کون واقف ہوگا کہ کسی بیماری کے

جراثیم بڑی آسانی سے ختم نہیں کیئے جا سکتے۔ اور یہ تو محبت کے جراثیم ہیں۔

جو سالہا سال سے ہمارے دلوں میں پرورش پا رہے ہیں۔

نیرؔ : میں نے کہا نا میرے پاس جذباتی باتوں کے لیئے وقت نہیں ہے۔

فیضی : مجھے کچھ کہنے تو دو۔

نیرؔ : فضول ہے تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔

فیضی : یہ تمہاری بھول ہے نیرؔ!

نیرؔ : چلو یونہی سہی۔ پر میرا وقت ضائع نہ کرو۔

فیضی : (جذباتی شدت میں) اتنی کٹھور نہ بنو نیرؔ! اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔

نیرؔ : میں خود کو دھوکا کیوں دوں گی؟

فیضی : میں خوب سمجھتا ہوں، یہ الفاظ تمہارے دل کے الفاظ نہیں۔ ایک طویل مدت

کے خواب اس طرح ختم نہیں کیئے جا سکتے۔ برسوں کی امیدوں کو اس طرح پامال

نہیں کیا جا سکتا۔ خود کو جس قدر سنگ دل ثابت کرنا چاہتی ہو اتنی سنگدل تم نہیں

ہو اور نہ ہو سکتی ہو۔

نیرؔ : میں نے حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ اس میں سنگدلی کا کیا سوال؟

فیضی : میں جانتا ہوں، اور تم بھی اچھی طرح جانتی ہو، یہ حقیقت نہیں ہے۔

نیرؔ : (غصّے سے) یہ تمہارا وہم ہے، تمہاری خام خیالی ہے۔

فیضی : نیر! میں پوچھتا ہوں جس ہستی کو تم نے بچپن میں اپنا ساتھی سمجھا — نوجوانی میں جسے اپنا رفیق جانا، اور جس کے قریب رہ کر تم نے بے شمار خوشی بھری گھڑیاں گزاریں. آج اس سے کہہ رہی ہو کہ میرے پاس فضول باتوں کے لئے وقت نہیں ہے۔ انسان اپنے ماضی سے اس قدر بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ اپنے پچھلے واقعات کو اس طرح فراموش نہیں کر سکتا۔ اگر میں واقعی تم پر بوجھ ہوں تو صاف کہہ دو، مجھے جو کچھ کہنا ہے، میں جو کچھ کہنے کے لئے آیا ہوں نہیں کہوں گا۔ اپنی خوں گشتہ آرزوئیں دل میں چھپا کر چلا جاؤں گا۔ کہو چلا جاؤں ؟

نیر : (ذرا نرم ہو کر) میں کہتی ہوں ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔

فیضی : نہ سہی۔ کم از کم میرے دل کی بھڑاس تو نکل جائے گی — میں اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیا کروں گا کہ مجھے جو باتیں کہنا تھیں وہ کہہ چکا ہوں۔ نیر! تمہیں یاد ہے ہم اپنے بچپن میں کیسی معصوم شرارتیں کیا کرتے تھے۔ کس طرح کاغذی کشتیاں پانی میں بہایا کرتے تھے۔ یہ کشتیاں کچھ دور جا کر بکھر جاتی تھیں — ٹوٹ جاتی تھیں اور ہمیں اپنی محنت کے اکارت جانے پر بڑا افسوس ہوتا تھا کبھی کبھی تمہاری پیاری آنکھوں میں آنسو بھی آجاتے تھے۔ تمہیں یاد ہے نا — وہ زمانہ نیر! کیا محبت کی وہ باتیں کاغذی کشتیاں ہی ثابت ہوئیں — محض کاغذی کشتیاں، جو پانی کی لہروں میں بہہ کر ختم ہو جاتی ہیں — تمہیں یاد ہے —

(نیر دو تین لمحوں کے لئے اسے گھور کر دیکھتی ہے، جیسے

متاثر ہو رہی ہے، پھر جلدی سے سنبھل جاتی ہے)

تم تو ایک لمحے کے لئے بھی میری جدائی برداشت نہیں کرتی تھیں، مگر آج

نیر : اس زمانے کی یادیں اس زمانے کے ساتھ ختم ہو گئیں۔

فیضی : تم غلط کہہ رہی ہو نیر! انسان اپنے بچپن کو بھول نہیں سکتا۔ کسی حالت میں بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ بچپن کی میٹھی یاد، دور سے آتی ہوئی شہنائی کی آواز کی طرح

کبھی نہ کبھی ضرور اس کے دل میں تیرنے لگتی ہے کیا اپنی تنہائیوں میں تم نے کبھی یہ محسوس کیا کہ تم ایک چھوٹی سی لڑکی بن کر ایک باغ میں کسی کا انتظار کر رہی ہو، اتنے میں دو ننھے ننھے ہاتھ تمہاری آنکھوں کو دبانے لگتے ہیں، تم پوری طاقت سے کام لے کر ان ہاتھوں کو ہٹانے کی کوشش کرتی ہو، اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ہاتھ کس کے ہیں تم اس کا نام نہیں لیتیں —— اور پھر جب ہاتھ ہٹ جاتے ہیں تو تم اپنے ساتھی کو دیکھ کر اس طرح خوش ہوتی ہو کہ تمہاری آنکھیں جگنوؤں کی طرح چمکنے لگتی ہیں۔ مجھے بچپن کا ایک ایک واقعہ یاد ہے مگر تم کہتی ہو اس زمانے کی یادیں اس زمانے کے ساتھ ختم ہو گئیں —— اور نیّر! تمہیں وہ زمانہ بھی یاد ہوگا جب ہم گھنٹوں چاندنی راتوں میں ایک دوسرے کے سامنے چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے۔ ہماری زبانیں خاموش رہتی تھیں۔ مگر ہماری آنکھیں ایک دوسرے سے ہزاروں ایسی باتیں کہہ لیتی تھیں، جو انسان کی قوتِ گویائی سے باہر ہیں —— اور پھر تمہیں وہ وقت بھی نہیں بھولا ہوگا جب میں نوکری کے لئے ایران جا رہا تھا۔ تم نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا لیکن تمہاری آنکھیں جو کچھ کہہ رہی تھیں اسے دردناک سے دردناک شعروں میں بھی نہیں سمویا جا سکتا۔

نیّر: مانا مجھے سب کچھ یاد ہے، پر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

فیضی: (جیسے اس کے دل میں امید جاگ اٹھی ہے) میں نے کہا تھا نا انسان اس طرح اپنے ماضی سے الگ نہیں ہو سکتا۔ تم نے بالکل درست کہا ہے۔ یہ یادیں تمہاری روح میں رچ گئی ہیں۔ یہ باتیں تمہارے ذہن میں زندہ ہیں۔

نیّر: نہیں فیضی! یہ تمہاری خام خیالی ہے۔

فیضی: کیا خام خیالی ہے نیّر؟

نیّر: تم نے جو کچھ سوچا ہے تم جو کچھ سوچ رہے ہو فضول ہے، میرے لئے فضول ہے۔

فیضی: اپنے جذبات کے آگے مصنوعی دیوار کھڑی نہ کرو نیر! مصنوعی دیوار ——— آخر مصنوعی ہے، جذبات کے سیلاب کا مقابلہ نہیں کر سکتی ———

نیر: اب میری زندگی میں تمہارے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ زمانے کے نئے تقاضوں کے سامنے میں نے سر جھکا دیا ہے۔ میں زندگی کے رومانی دور سے دور جا چکی ہوں فیضی! اب نیر وہ نیر نہیں ہو سکتی جو کبھی تھی۔ اب پہلی نیر بننا اس کی طاقت سے باہر ہے۔

فیضی: نیر! یہ الفاظ کہتے ہوئے تمہیں اس بات کا احساس کیوں نہیں ہوتا کہ تمہاری ضد سے میرے تمام حسین خواب پامال ہو رہے ہیں۔ میری امیدیں اور آرزوئیں حسرتوں کی خاکستر میں دبی جا رہی ہیں۔ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ تم اتنی سنگدل نہیں ہو سکتیں۔ زندگی سے اس طرح نہیں کھیلا جا سکتا۔

نیر: زندگی کے ساتھ کھیلنا تم چاہتے ہو۔

فیضی: میں کھیل رہا ہوں جس نے محبت کو ہمیشہ ایک مقدس جذبہ سمجھا، جس نے اسے زندگی کے کسی دور میں بھی فراموش نہیں کیا ——— زندگی کے ہر دور میں ——— حالات کے ہر موڑ پر ایک خواب میرے ساتھ ساتھ بھٹکتا رہا۔ میں یہی خواب لے کر ایران گیا تھا، اور یہی خواب لے کر واپس آیا ہوں۔

نیر: حالات کی باگ ڈور انسان کے اپنے ہاتھ میں نہیں ہوتی فیضی! تم ابھی تک ماضی کی ننھی دنیا میں سانس لے رہے ہو اور میں ——— اور میں اس منزل پر پہنچ گئی ہوں جہاں فرائض ہی فرائض ہیں۔ والدین کی وفات کے بعد گھر کی تمام ذمہ داریوں کا بوجھ میرے کندھوں پر آ پڑا تھا، میں نے اس بوجھ کو اٹھا لیا ہے۔ اب میری زندگی سر تا پا مصروفیت ہے، ہسپتال کی مصروفیتیں، گھر کی مصروفیتیں، اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں اپنی چھوٹی بہن کے لئے ماں بھی ہوں، بہن بھی اور سہیلی بھی۔ وہ مجھے اپنا سب کچھ سمجھتی ہے۔ پہلا اور آخری سہارا جانتی ہے۔ اور میری کوشش یہ ہے کہ اس کا دل کسی وقت بھی، کسی طرح بھی آزردہ نہ ہو، میری ذرا سی خود غرضی بھی اس کا دل توڑ دے گی۔ وہ

ایک بڑی معصوم اور شرمیلی لڑکی ہے۔

فیضی: شادی کے بعد بھی تم اپنے فرائض ادا کر سکتی ہو۔

نیّر: نہیں۔ مجھے اس کی امید نہیں ——کون جانے شادی کے بعد کیا حالات ہوں —— کیا واقعات پیش آئیں!

فیضی: نیّر اپنی مسرتوں کا گلا گھونٹ کر فرض ادا کرنا بہت مہنگا پڑتا ہے۔ ایک موہوم خطرے کے پیشِ نظر اپنی اور میری آرزوؤں کو خاک میں نہ ملاؤ۔ جس طرح مجھے تم سے محبت ہے اسی طرح تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے۔

نیّر: محبت کا سوال اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ اب میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔

فیضی: اگر تمہیں محبت ہے تو یہ رکاوٹ خود بخود دور ہو جائے گی۔ ——تم اسے خود دور کرو گی! میری نیّر! ضد چھوڑ دو، آؤ ہاتھوں میں ہاتھ دے کر اپنی اس خوبصورت دنیا میں جائیں جو ہمیشہ ہمارے سنہرے سپنوں میں جھلملاتی رہی ہے۔ مجھے اپنا ہاتھ دو (نیّر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر)

نیّر: (ہاتھ چھڑا کر) نہیں فیضی! ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

فیضی: آخر کیوں؟

نیّر: (سر بلند کر کے) میں نے جو کچھ کہہ دیا ہے اس پر قائم ہوں۔

فیضی: تم قائم نہیں رہ سکتیں۔ محبت تمہاری ضد سے زیادہ طاقتور ہے۔ تم خود دیکھ لو گی، آزما لو گی۔

نیّر: مجھے معاف کر دو فیضی! میں —— نہیں جاؤ چلے جاؤ۔ خدا کے لئے چلے جاؤ۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔

فیضی: کیا فائدہ۔ تمہارے دل سے دور نہیں ہو سکوں گا!

نیّر: ہو جاؤ گے یقیناً ہو جاؤ گے۔

فیضی: نہیں نیّر خود کو فریب دینے کی کوشش نہ کرو۔

نیرؔ: یہ میرا فیصلہ ہے۔

فیضی: میں جانتا ہوں یہ تمہارے دل کا فیصلہ نہیں ہے۔ میں تمہارے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھ سکتا ہوں، وہاں ابھی وہی ہستی موجود ہے جس کو تم نے اپنا جیون ساتھی بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہا ہے۔

نیرؔ: نہیں — فیضی!

فیضی: نیرؔ — میری نیرؔ! تم — کس الجھن میں پھنس گئی ہو۔ میں جانتا تھا میرے خط کے جواب میں تم نے جو کچھ کہا ہے وہ محض ایک وقتی جذبہ ہے اسی لئے میں آگیا، اب کبھی نہیں جاؤں گا۔ اب ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔ ہمیشہ ایک دوسرے کے قریب۔ کوئی شخص بھی ہمارے درمیان حائل نہیں ہوگا۔ کوئی دیوار ————

نیرؔ: (سنبھل کر باوقار لہجے میں) نہیں، میرا فیصلہ اٹل ہے تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔

فیضی: نیرؔ

نیرؔ: خدا کے لئے چلے جاؤ — جاؤ — چلے جاؤ۔

فیضی: ایک بار پھر فریب دے رہی ہو خود کو

نیرؔ: میں نے کہہ دیا ہے تم چلے جاؤ۔

فیضی: نیرؔ! میں چلا جاؤں گا — مگر سن لو، اگر تم نے آخری مرتبہ بھی کہہ دیا، چلے جاؤ تو میں تمہارے گھر سے ہی نہیں، شہر سے نہیں اس ملک سے بھی چلا جاؤں گا۔ سوچ لو۔

نیرؔ: تم جا سکتے ہو۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔

فیضی: تو — میں جا رہا ہوں — آج شام کی گاڑی سے وہیں روانہ ہو جاؤں گا۔ جہاں میں نے اپنی زندگی کے نو سال گزارے تھے — ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہیں چلا جاؤں گا، تم کبھی میری صورت بھی نہیں دیکھ سکو گی (فیضی جلدی سے نکل جاتا ہے نیرؔ خود کو کوچ میں گرا دیتی ہے

—— چند لمحے چپ چاپ بیٹھی رہتی ہے، اس اثناء میں اپنی
انگلیاں بالوں میں پھیرتی رہتی ہے۔ جیواں آتی ہے گھبرائی
ہوئی پریشان سی۔ نیر خاموش رہتی ہے اور استفسار انگیز نظروں
سے اسے دیکھتی ہے۔ جیواں اس کے پاس آتی ہے،

جیواں: (رازدارانہ لہجے میں) بی بی رو رہی ہے۔
نیر: (جلدی سے بیٹھ کر) کیا؟
جیواں: بی بی رو رہی ہے۔
نیر: کیوں؟ کیا کالج نہیں گئی وہ ——
جیواں: اللہ جانے کیا بات ہے۔ میں ادھر سے گزری تو دیکھا — بی بی آنکھوں پر
ہاتھ رکھے رو رہی ہے سسکیاں خود سنی ہیں میں نے
نیر: کہاں ہے؟
جیواں: اپنے کمرے میں ——

نیر کمرے سے جانے لگتی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے جیواں
بھی چلی جاتی ہے، اب سٹیج خالی ہے
چند لمحے خالی رہتی ہے۔
باہر سے نیر کی دو تین بار آواز آتی ہے "اختر! اختر!!"
اختر آتی ہے — ایک گوشے میں کھڑی ہو جاتی ہے۔
رومال سے آنکھیں اور ناک پونچھتی ہے۔ نیر اور جیواں
آتی ہیں —— ان کی نظر اختر پر نہیں پڑی)

نیر: یہاں بھی نہیں۔ کہاں گئی۔ تو نے کہاں دیکھا تھا اسے؟
جیواں: اپنے کمرے میں —— (اختر کو دیکھ کر) وہ ہے تو
(نیر اختر کی طرف قدم اٹھاتی ہے۔ اختر دروازے سے باہر جانے

لگتی ہے)

نیرّ: اختر! ٹھہرو۔ جیواں تم جاؤ۔

جیواں: اچھا بی بی!

(جیواں چلی جاتی ہے۔ اختر وہیں رک جاتی ہے۔ نیرّ اس کے پاس جاتی ہے)

نیرّ: کیا بات ہے اختر؟

(اختر خاموش رہتی ہے)

اختر!

اختر: (روندھے گلے سے) جی!

نیرّ: بات کیا ہے! تو رو کیوں رہی تھی؟

اختر: نہیں تو باجی!

نیرّ: کنسرٹ کیوں نہیں گئیں؟

(اختر خاموش رہتی ہے)

خاموش کیوں ہو؟

(اختر سر جھکائے کھڑی ہے نیرّ اس کا بازو پکڑ کر اسے کوچ میں
بٹھا دیتی ہے اور خود بھی اس کے پہلو میں بیٹھ جاتی ہے)

کہو کیا معاملہ ہے؟

اختر: کوئی بات نہیں۔

نیرّ: تم رو کیوں رہی تھیں۔ تمہاری آنکھیں ابھی تک گیلی ہیں۔

اختر: یونہی — میں ٹھیک ہوں۔

نیرّ: تم اس طرح غمگین کیوں ہو، مجھ سے چھپاؤ نہیں۔ جو بات ہے صاف طور پر کہہ دو۔

(اختر اٹھنے لگتی ہے۔ نیرّ اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے)

جاؤ نہیں اختر! یہ ہو کیا گیا ہے تمہیں؟ ایک گھنٹہ پہلے تم بالکل ٹھیک تھیں

اور کنسرٹ جا رہی تھیں، یہ ہو کیا گیا ہے ایک دم، کنسرٹ میں کسی نے کچھ کہا؟

اختر: نہیں!

نیّر: تمہیں ضرور کسی نے تنگ کیا ہے مجھے بتاؤ میں اسے کالج سے نکلوا دوں گی۔

اختر: ایسی کوئی بات نہیں باجی!

نیّر: پھر؟

اختر: یونہی بیٹھی تھی، کچھ یاد آ گیا تھا ـــ بس!

نیّر: (اختر کو غور سے دیکھ کر) دیکھو اختر تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔

اختر: کیا چھپاؤں گی باجی!

نیّر: میری بہن! (اس کی گردن میں بازو حمائل کر دیتی ہے۔ اختر کا سر اس کے سینے سے لگ جاتا ہے) میں صرف تمہاری باجی نہیں، ماں بھی ہوں اور سہیلی بھی ہوں۔ باجی اور ماں سے کوئی چیز چھپائی جا سکتی ہے۔ اپنی سہیلی سے نہیں۔ ہم دونوں سہیلیاں ہیں۔ ہمیں اپنا دکھ سکھ ایک دوسرے سے چھپانا نہیں چاہیئے۔

(اختر رونے لگتی ہے)

پھر رونے لگیں!

اختر: میں کچھ نہیں کہہ سکتی باجی! مجھے جانے دو۔

نیّر: نہیں اختر! میری بہن نہیں، تم نہیں جانتیں تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرے دل کی کیا حالت ہے مجھے کتنا دکھ ہو رہا ہے۔ بتاؤ، بتا دو!

اختر: کس زبان سے کہوں! اوہ ـــــ میرے اللہ!

نیّر: میں تمہاری سہیلی ہوں نا۔ سہیلیوں سے کیا پردہ؟

اختر: باجی!

نیّر: ہاں ہاں کہو!

اختر: سجاد ـــ باجی خدا کے لئے مجھ سے کچھ نہ کہلواؤ

نیرؔ : کیا سجاد؟

اخترؔ: نہیں مانتیں تو سن لو۔ میں نے جھوٹ بولا تھا کہ کنسرٹ میں جا رہی ہوں۔ وہ کالج گراونڈ میں میرا انتظار کر رہا تھا ـــــ وہ

نیرؔ : گھور کر اسے دیکھتی ہے۔ جیسے اس کے الفاظ پر اعتبار نہ کر رہی ہو۔ تم ـــــ

اخترؔ: میں بڑی نالائق بہن ہوں باجی! ـــــ اکثر آپ کو جھوٹے بہانے سنا کر اُدھر جاتی رہی ہوں۔

نیرؔ : اس سے ملتی رہی ہو؟

اخترؔ: رسسکیوں میں، باجی!

نیرؔ : پھر؟

اخترؔ: وہ میرے دل و دماغ پر اس طرح چھا گیا ہے کہ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

نیرؔ : مجھے کبھی بتایا ہی نہیں تم نے۔

اخترؔ: آج اس سے کالج گراؤنڈ میں ملنے کا وعدہ تھا۔ جب آپ نے یہاں آکر میرے جانے سے پہلے باتیں کیں تو میرے دل کو دھچکا سا لگا مجھے محسوس ہوا میں آپ کو سخت دھوکا دے رہی ہوں۔ اور میں نے اپنے دل میں عہد کر لیا کہ اب کبھی اس سے نہیں ملوں گی۔ اس سے تعلقات منقطع کر لوں گی۔ یہ بات سوچ کر میں نے ادھر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور اپنے کمرے میں چلی گئی اور کتاب پڑھنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد جب میری نظر کھڑکی کے باہر پڑی تو میں نے دیکھا وہ نیچے کھڑا ہے۔ وہ بیتاب ہو کر یہاں آ گیا تھا ـــــ میں نے اس کا خیال دماغ سے ہٹانے کے لئے چاہا کہ کہیں دوسری جگہ چلی جاؤں ـــــ میں سلمیٰ کے یہاں چلی گئی۔ مگر وہاں کھوئی کھوئی سی رہی ـــــ اور جب واپس اپنے کمرے میں آئی تو وہ وہیں کھڑا تھا۔ اب تک وہیں کھڑا ہے اس کی نگاہوں میں التجا ہے۔ درد ہے۔ دکھ ہے۔ اس نے کئی بار مجھ سے

کہا ہے۔ اگر تم نے مجھے چھوڑ دیا تو میں زندگی کا دامن چھوڑ دوں گا۔ میں جانتی ہوں وہ درست کہتا ہے۔ اب بھی اس کی نظریں یہی الفاظ کہہ رہی ہیں وہ نیچے کھڑا ہے۔ باجی میں کیا کروں۔ میں اس کی نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی!

نیرّ: (حیران ہے کہ کیا کہے) تو ــــ مگر

اختر: (جلدی سے) وہ یونہی کھڑا رہے گا ــــ اس کی نگاہوں میں یہ التجا ہمیشہ رہے گی۔ مجھے معاف کر دو میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گی باجی!

(اٹھ بیٹھتی ہے)

نیرّ: مگر ٹھہرو تو ــــ

اختر: نہیں باجی! (ہاتھ چھڑا کر کمرے سے نکل جاتی ہے۔ نیرّ یوں کھڑی ہے جیسے سُن ہو گئی ہو۔)

(جیواں آتی ہے)

جیواں: بڑی بی بی! یہ اختر کہاں گئی ــ بڑی تیزی سے ــ نیچے اتر گئی ہے؟

نیرّ: تانگہ لاؤ ــــ وقت کیا ہوا ہے؟

جیواں: پانچ

نیرّ: تو جلدی سے تانگہ لاؤ ــ سٹیشن کے لئے۔ جلدی کرو ــ جلدی

(جیواں کمرے سے نکل جاتی ہے۔ نیرّ بھی چلی جاتی ہے)

چور

کردار

ناہید..........

زینو........

اختر...........

جبار.........

منظر

(جس وقت پردہ اٹھتا ہے ہم اپنے سامنے کمرے کا وہی حصہ دیکھ سکتے ہیں جہاں کھڑکی اور روشندان میں سے چاندنی اندر داخل ہو کر پھیل چکی ہے۔ اس حصے کے علاوہ باقی جگہ اندھیرا ہے۔ اس وقت شام کے تقریباً سات بجے ہیں۔ کمرے کی کھلی کھڑکی کے سامنے ناہید کرسی میں بیٹھی پیانو کے پردے پر آہستہ آہستہ اس انداز سے انگلیاں پھیر رہی ہے۔ جیسے وہ کسی خاص خیال میں غرق ہو اور شغل محض بے خیالی میں جاری ہو۔ ناہید کا سن بیس اور پچیس کے درمیان ہو گا۔ چھریرے بدن کی خوبصورت لڑکی اور لباس عام پنجابی عورتوں کا، یعنی قمیص، شلوار، دوپٹہ۔

چند لمحے اس کی انگلیاں پیانو کے پردے پر حرکت کرتی رہتی ہیں، اس کے بعد وہ ہاتھ ہٹا لیتی ہے اور آنکھیں بند کر کے اپنا سر کرسی کی پشت سے لگا دیتی ہے پشت کی طرف سے زینو آتی ہے۔ زینو ادھیڑ عمر کی خادمہ ہے آواز میں شفقت اور دردمندی کا احساس، زینو جھک کر ناہید کو دیکھتی ہے آواز دیتی ہے "بی بی" ناہید اسی عالم میں بیٹھی رہتی ہے۔ جیسے یہ آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچی۔ زینو دوبارہ آواز دیتی ہے۔ اب کے ناہید آنکھیں کھول دیتی ہے اور زینو کو دیکھتی ہے)

زینو: کیا بات ہے بی بی! اندھیرے میں کیوں بیٹھی ہو؟
ناہید: اندھیرا کہاں ہے مائی
زینو: بلب تو روشن نہیں ہے۔
ناہید: چاندنی جو ہے۔
زینو: پر اس طرح کیوں بیٹھی ہو بی بی؟
ناہید: تو کیا کروں؟
زینو: صاب صبح سے خرید و فروخت کر رہے ہیں تم نے بھی اپنی مرضی کی چیزیں خریدی ہوتیں۔
ناہید: وہ جو خرید رہے ہیں مجھے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے؟
زینو: پھر بھی بی بی! کل کتنی بڑی خوشی کا دن ہے۔ تم اللہ رکھے دلہن بنوگی۔ یہ بھی کبھی ہوا ہے کہ دلہن اپنی مرضی سے کچھ نہ خریدے اور چپ چاپ بیٹھی رہے۔
ناہید: جب سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہے تو میں کیا کروں؟ پروفیسر صاحب چلے گئے؟
زینو: ابھی ابھی گئے ہیں۔ مجھے کہتے گئے ہیں کل تمہیں زیادہ کام کرنا ہوگا، اس لئے آج جلدی سو جاؤ۔
ناہید: تو سو جاؤ جا کر
زینو: پر بی بی ایک بات پوچھوں؟
ناہید: ہوں:
زینو: تم اس طرح چپ چاپ کیوں بیٹھی ہو۔ تمہیں تو آج بڑا خوش ہونا چاہیئے کل سے تم اس گھر کی مالکن بن رہی ہو، اور کون ہے تمہارے سوا اس گھر میں۔؟
ناہید: (مصنوعی مسکراہٹ سے) پھر کیا کروں؟
زینو: زیادہ خوش نظر نہیں آتیں۔ کوئی فکر ہے کیا؟
ناہید: کوئی فکر نہیں۔
زینو: کوئی فکر نہیں، پر کچھ اداس اداس نظر آتی ہو۔

ناہید: کبھی کبھی اپنا پچھلا زمانہ یاد آجاتا ہے ــــ وہ منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے جب ہم لٹ لٹا کر یہاں پہنچے تھے۔

زینو: ہائے، ایسے اچھے وقت میں یہ بدشگونی ٹھیک نہیں بی بی!

ناہید: پھر بھی وہ باتیں یاد آجاتی ہیں۔

زینو: یاد نہ کرو تو کیوں یاد آئیں گی بھلا؟

ناہید: تم پگلی ہو مائی! تمہیں کیا خبر۔ بعض اوقات کیا کچھ یاد آجاتا ہے اور دل کی کیا حالت ہو جاتی ہے ــــ اچھا تم جاکر سو رہو۔

زینو: کل کیا کچھ ہونا چاہیئے۔ یہ ناذرا سوچ لیں؟

ناہید: انہوں نے بتا تو دیا تھا۔

زینو: بتا دیا تھا پر یہ سب کچھ کس طرح ہوگا؟

ناہید: تم بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

زینو: دروازہ کھلا رہے؟

ناہید: کیا حرج ہے؟

زینو: اچھا بی بی! میری ضرورت ہو تو آواز دے لینا۔

ناہید: سن لیا ہے بابا۔

زینو ناہید کی پشت کی طرف جاکر اندھیرے میں گم ہو جاتی ہے۔ ناہید دوبارہ پیانو بجانے لگتی ہے ــــ چند لمحے گزر جاتے ہیں۔

اندھیرے سے "ناہید" کہتی ہوئی ایک آواز آتی ہے۔ ناہید چونک سی پڑتی ہے۔ اس کی انگلیاں رُک جاتی ہیں۔ اور وہ اندھیرے کی طرف اپنا منہ موڑ لیتی ہے۔ اختر آتا ہے۔ درمیانہ قد و قامت کا نوجوان۔ وجیہہ تو نہیں مگر بدصورت بھی نہیں۔ معمولی پتلون اور قمیص میں ملبوس۔ پاؤں میں چپل ــــــــ

ناہید اسے دیکھ کر گھبرا سی جاتی ہے اور کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں

میں حیرت ہے۔ اس کے مقابلے میں اختر مسکرا رہا ہے)

ناہید: اختر!

اختر: کس قدر حیران ہو گئی ہو مجھے زندہ دیکھ کر

ناہید: تم یہاں؟

اختر: ابھی تک شاید تمہیں اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا۔

ناہید: کتنی عجیب بات ہے! تم زندہ یہاں اور اس وقت؟

اختر: کیا میری طرف سے بالکل مایوس ہو چکی تھیں تم؟

ناہید: بالکل!

اختر: لیکن میں کبھی مایوس نہیں ہوا تھا۔ میرے دل میں امید کی ایک ننھی سی قندیل ہمیشہ روشن رہی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ضرور تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا اور دیکھ لو آج زندہ و سلامت پہنچ گیا ہوں ـــــ (ناہید اسے برابر گھور گھور کر دیکھ رہی ہے)

دنیا میں کیسے کیسے اتفاقات ہوتے رہتے ہیں۔

ناہید: اختر!

اختر: یہ محض اتفاق تھا کہ تمہارا پتہ مل گیا، ہوا یوں کہ کل ایک ڈاکٹر کے ہاں ایک ایسے شخص سے ملاقات ہو گئی جو تمہارے محلے میں رہتا ہے۔ دورانِ گفتگو میں اس نے بتایا کہ پروفیسر جبار ایک بازیافتہ خاتون ناہید سے نکاح کر رہا ہے! یہ بات سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری گمشدہ جنت اسی پروفیسر کی چار دیواری میں بند ہے۔ اب یہ بتانا فضول ہے کہ میں کس طرح یہاں پہنچ گیا مجھے اس طرح گھور گھور کر کیوں دیکھ رہی ہو ـــــ اتنی پریشان کیوں ہو ناہید؟

ناہید: تمہیں نہیں آنا چاہیئے تھا۔

اختر: کیا ـــ کیا کہہ رہی ہو ناہید؟

ناہید: وقت گزر چکا ہے۔

اختر: کیا تم ——؟

ناہید: نہیں —— نکاح کل ہونے والا ہے۔

اختر: تو قانون کی دیوار ابھی ہمارے درمیان کھڑی نہیں ہو سکی!

ناہید: پھر بھی جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔

اختر: میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔

ناہید: تم اس وقت آئے ہو جب وقت گزر چکا ہے۔

اختر: وقت کیسے گذر چکا ہے آج کی شام اور کل کی صبح میں کافی فاصلہ ہے ابھی قانون ہم سے کافی دور ہے۔

ناہید: اختر!

اختر: میری ناہید۔

ناہید: تمہیں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ اب میرا تم سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ خاموشی سے چلے جاؤ، یہ سوچ کر چلے جاؤ کہ ناہید اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ ناہید مر چکی ہے۔

اختر: یہ نہیں ہو سکتا ناہید!

ناہید: بہت انتظار کیا میں نے تمہارا۔ سال بھر انتظار کرتی رہی تمہاری کوئی خبر نہ ملی۔ کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ پھر میں نے سوچا

اختر: کہ اختر مر چکا ہے۔

ناہید: تم سے ناامید ہو گئی تھی۔

اختر: ناامید کیوں ہو گئی تھیں؟

ناہید: تم نہیں جانتے ہم کتنے بڑے طوفان میں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ انسان حیوان بن چکا تھا۔ ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ کس شخص کو اس

بات کا یقین ہو سکتا تھا کہ وہ زندہ رہے گا اور زندہ رہ کر پاکستان کی سرحد میں داخل ہو سکے گا، ضعیف باپ خوف و دہشت سے مر گیا تھا بھائی کو ظالموں نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا تمہارے متعلق مجھے صرف یہ خبر ملی تھی کہ پولیس تمہیں گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ اور کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ قیامت کی ان گھڑیوں میں ہم سب اپنی اور عزیزوں کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ یہ حالت تھی کہ جالندھر کیمپ میں لائی گئی۔ چاروں طرف کوئی عزیز آشنا نہ تھا۔ اس بھری دنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی تھی۔ وہاں سے لوگ مجھے لاہور کے بازیافتہ خواتین کے کیمپ میں لے آئے۔

تم اندازہ نہیں کر سکتے اس وقت میرا کیا حال تھا۔ زندگی سے بالکل بیزار ہو چکی تھی۔ اگر بس چلتا تو کسی نہ کسی طرح زندگی کا خاتمہ کر دیتی۔ اسی زمانے میں ایک لڑکی سے تعلقات بہت بڑھ گئے۔ پروفیسر جبار اس لڑکی کا رشتہ دار ہے۔ وہ ایک دن اسے لینے آیا اور ناصرہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے آئی۔ اس طرح میں یہاں پہنچ گئی۔

اختر: پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا تھا اور چند ماہ کے بعد خود ہی چھوڑ دیا تھا۔ پاکستان پہنچ کر میں تمہاری تلاش میں کراچی چلا گیا تھا، وہاں تمہارے دو تین رشتہ دار موجود ہیں۔

ناہید: میرے اختیار میں کیا تھا مجھے کیا سوجھ سکتا تھا میں کہاں جا سکتی تھی، وہ تو ایک سیلاب تھا جو مجھے اور میرے ساتھ ہزاروں بدنصیب ہستیوں کو بہا کر یہاں لے آیا تھا۔ یہاں پہنچ کر میں نے تمہارا انتظار کیا —— مگر ——

اختر: تو کیا میں آ نہیں گیا؟

ناہید: اب فضول ہے۔

اختر: لیکن کیوں —— آخر کیوں ناہید؟

ناہید: میں کہہ نہیں چکی کہ وقت گزر چکا ہے، انتظار کی گھڑیاں ختم ہو چکی ہیں۔

اختر: میں زندہ ہوں تم زندہ ہو، ابھی کسی قانون نے تمہیں مجھ سے چھینا نہیں پھر بھی تم گھبرا رہی ہو۔

ناہید: ناہید قانون میرے اور تمہارے درمیان حائل ہو چکا ہے۔

اختر: نہیں ابھی نہیں حائل ہو سکا۔

ناہید: مگر جسے میں قانون کہتی ہوں وہ تو حائل ہو گیا ہے۔ میں پروفیسر سے وعدہ کر چکی ہوں کہ اب آخری سانس تک اسی گھر میں رہوں گی۔

اختر: جب پروفیسر کو حقیقتِ حال کا علم ہو جائے گا، تو وہ خود اس وعدے کو ختم کر دیگا۔

ناہید: تم پروفیسر کو نہیں جانتے اختر! میں نے اس کے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا ہے اس کے گہرے دکھ کا اندازہ لگایا ہے۔ میں کبھی اس کا دل نہیں توڑوں گی۔ بیچارہ پہلے ہی کافی دکھی ہے۔ اسے اپنی منگیتر سے بڑی محبت تھی۔ مگر اس سے پیشتر کہ وہ دلہن بن کر اس گھر میں آئے، ناگاں کسی وبا کا شکار ہو کر چل بسی۔ اس حادثے نے اس کے دل و دماغ کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ ہر وقت اداس رہنے لگا۔ اپنے فرائض کے علاوہ اسے کسی چیز سے دلچسپی نہ رہی، میں جب آئی تو اس کی یہی حالت تھی، پھر آہستہ آہستہ اس کا جمود ٹوٹنے لگا وہ میری ذات میں دلچسپی لینے لگا۔ پھر بھی میں نے کبھی اسے اس بات کا موقعہ نہیں دیا تھا کہ وہ دل کی بات زبان پر لے آئے۔ دن اسی عالم میں گزرتے جا رہے تھے، میں سمجھتی تھی کہ اگر تم زندہ ہو تو ہم ایک دوسرے سے الگ نہیں رہیں گے۔ چپ چاپ تمہارا انتظار کرتی رہی۔ مگر انتظار کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ پروفیسر نے بارہا مجھ سے پوچھا: تم بیٹھے بیٹھے اس طرح بے چین کیوں ہو جاتی ہو—؟ لیکن میں اسے یہی بتاتی رہی کہ اپنا پچھلا گھر، اپنے عزیز یاد آ جاتے ہیں اور اس پر وہ زیادہ شدت سے میری دلجوئی کرنے لگتا۔ آخر تم سے بالکل ناامید ہو کر میں نے یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

اختر: جب میں آ گیا ہوں تو یہ فیصلہ ختم ہو جاتا ہے۔

ناہید: نہیں اختر! یہ نہیں ہو سکتا۔

اختر: ناہید! ایک اخلاقی مفروضے کی بناء پر خود کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔ ہماری

محبت اور دلی تعلق کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہوگا کہ مایوس ہو جانے کے باوجود ہم ایک دوسرے کا انتظار کرتے رہے ہیں۔

ناہید: یہ درست سہی پھر بھی

اختر: پھر بھی ——

ناہید: خدا کے لئے چلے جاؤ —— میں اور کچھ بھی سننا نہیں چاہتی۔

اختر: (ملائمت سے) ناہید! تمہیں کیسے بتاؤں کہ اس گھڑی کا میں نے کتنے گہرے کرب اور اضطراب سے انتظار کیا ہے۔ تمہارے بغیر یہ وسیع کائنات ایک ویرانہ نظر آتی تھی آج تم نظر آئی ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس ویرانے میں پھر رونق آگئی ہے۔ سونی محفل پھر آباد ہو گئی ہے اور میرے اجڑے ہوئے باغ میں رنگ و بو کا طوفان ایک بار پھر چھا گیا ہے۔ تمہیں یاد ہے (ایسی ہی چاندنی راتوں میں ہم گھنٹوں ندی کنارے چپ چاپ گھوما کرتے تھے۔ کتنے پر کیف اور حیات افروز تھے وہ لمحے ناہید! میں ان سب خوب صورت لمحوں کی میٹھی میٹھی یاد کو اپنے ذہن میں سمیٹ کر ہر جگہ تمہیں ڈھونڈتا رہا ہوں، ہر گلی، ہر کوچے میں تمہیں تلاش کرتا رہا ہوں، تم مل گئی ہو تو میری کھوئی ہوئی جنت مجھے واپس مل گئی ہے میری زندگی کے طاق پر بجھا ہوا دیا پھر روشن ہو گیا ہے۔ ہم اپنے پرانے خوابوں کو پھر زندگی دے سکتے ہیں۔ ہم اپنی دنیا پھر آباد کر سکتے ہیں۔ ہماری راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں قسمت سے بہت اچھا موقعہ مل گیا ہے۔ صرف چند لمحوں میں ہم اس چار دیواری سے نکل سکتے ہیں، صرف چند لمحوں میں ناہید!

میری —— ناہید! (ذرا سا توقف)۔

ناہید: نہیں! نہیں!! (اختر کو ہاتھ سے دھکیلنے کی کوشش کرتے ہوئے) چلے جاؤ۔ میں کہتی ہوں چلے جاؤ!

اختر: میں جانتا ہوں یہ محض ایک جذباتی اُبال ہے۔

ناہید : یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔

اختر : اس فیصلے کی حیثیت ایک کچے دھاگے سے زیادہ نہیں ! یہ میں خوب جانتا ہوں اور تم بھی جانتی ہو۔

ناہید : یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ اگر تم اس وقت آتے جب میں تمہارا انتظار کر رہی تھی تو یہ ایک الگ بات ہوتی۔ مگر اب مجھے پریشان کر کے ایک اخلاقی جرم کے مرتکب ہو رہے ہو۔ میں اپنے ہونے والے شوہر کے ننگ و ناموس کی امانتدار ہوں۔

اختر : (ہنس کر) معلوم ہوتا ہے میری ناہید کو یہاں کتابوں کے مطالعے کا کافی موقعہ ملا ہے۔

ناہید : (غصے سے) اختر !

اختر : دیکھو ناہید ! اب یہ مصنوعی خول اتار ڈالو۔ ہمیں اس موقعے کو ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

ناہید : مجھے مجبور نہ کرو۔ جاؤ، خدا کے لئے چلے جاؤ۔

(باہر سے جبار کی آواز آتی ہے۔ "زینو!")

وہ آگئے ہیں —— اب کیا ہوگا —— تم اب بھی جا سکتے ہو۔

اختر : تمہیں نکاح سے انکار کرنا ہوگا۔

ناہید : نہیں !

اختر : تو پھر مجھے خود کہنا پڑے گا۔

ناہید : میں کہتی ہوں اختر جاؤ (اسے دھکیلتے ہوئے) جاؤ، میں مجبور ہو جاؤں گی۔ میں نہ جانے کیا کر بیٹھوں گی۔

اختر : تم جو چاہے کرو۔ حقیقت چھپی نہیں رہے گی۔

ناہید : میں آخری بار التجا کرتی ہوں، چلے جاؤ۔

اختر : وعدہ کرو نکاح سے انکار کر دو گی اور ——————

ناہید : تم نہیں جاؤ گے ؟

اختر : ہرگز نہیں !

رناہید اسے گھور کر دیکھتی ہے پھر بلند آواز سے کہتی ہے "چور! چور!"
باہر سے جبّار کی گھبرائی ہوئی آواز آتی ہے "کہاں ہے؟ زینو باہر کا
دروازہ بند کر دو، جلدی کرو" اندھیرے میں تیز تیز چلنے کی آواز۔
اختر جلدی سے اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے۔ جبّار کی قریب سے
آواز آتی ہے "ناہید! کہاں ہو تم؟" بلب روشن ہو جاتا ہے۔ اب
ہم اپنے سامنے ایک وسیع اور شاندار کمرہ دیکھتے ہیں۔ ناہید پیانو
کے پاس سر جھکائے کھڑی ہے۔ جبار نے دروازے کے قریب اختر
کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔ زینو سوئچ کے پاس پریشان کھڑی ہے۔)

جبّار: (گرج کر) کون ہو تم؟

(اختر خاموش رہتا ہے۔ ناہید دروازے میں سے نکل جاتی ہے۔)

میں پوچھتا ہوں کون ہو تم؟

اختر: کیا آپ کو معلوم نہیں میں کون ہوں؟

جبّار: پاجی! بدمعاش! ابھی تجھے مزہ چکھاتا ہوں، سمجھا تھا گھر میں کوئی مرد نہیں، سب
کچھ لے کر چمپت ہو جاؤں گا۔ ابھی بھجواتا ہوں جیل میں۔

اختر: بڑے شوق سے۔

جبّار: (طمانچہ مار کر) چپ بے شرم۔ کتنی ڈھٹائی سے کہتا ہے بڑے شوق سے۔

زینو! باہر کا دروازہ بند کر دو۔ جلدی کرو۔

(اختر اپنا گال سہلانے لگتا ہے۔ زینو کمرے سے نکل جاتی ہے۔)

اختر: دیکھئے صاحب! آپ مجھے قانون کے حوالے کر رہے ہیں۔ آپ کو دست درازی
کا شاید حق نہیں!

جبّار: چور کے ساتھ جو کچھ بھی کیا جائے کم ہے۔

اختر: فی الحال تو آپ وہی کارروائی کیجیے جو آپ کو کرنی چاہیئے۔ بڑے اطمینان سے

ٹیلی فون کیجئے۔ میں بھاگنے کی قطعاً کوشش نہیں کروں گا۔

جبار: اب تم بھاگ بھی کیسے سکتے ہو۔ ساتھ والے کمرے میں ٹیلی فون ہے اور تم نے ذرا بھی بھاگنے کی کوشش کی تو الٹا نقصان اٹھاؤ گے۔

اختر: تو جائیں!

(جبار اختر پہ قہر آلود نظریں ڈال کر دروازے میں سے گزر جاتا ہے۔ اختر وہیں کھڑا رہتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد جبار آتا ہے)

اختر: آرہی ہے پولیس؟

جبّار: ہاں! (اختر کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

اختر: آپ مجھے جکڑ کر تکلف کر رہے ہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے بھاگوں گا نہیں۔

جبار: پولیس نہیں آسکتی۔

اختر: کیوں؟

جبّار: فون خراب ہو گیا ہے کم بخت!

اختر: تو آپ کو زیادہ تکلیف ہو گی کیوں کہ اب آپ کو میرے ساتھ پولیس سٹیشن تک چلنا ہو گا، خدارا میرے ہاتھ کو اتنی مضبوطی سے تو نہ پکڑیئے۔ آپ کو یقین دلاتا ہوں کوئی غیر مناسب حرکت نہیں کروں گا، مجھ پہ اعتماد کیجئے۔

(جبار اس کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے)

میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ آپ مجھے بالکل چھوڑ دیں۔ اگر آپ پولیس سٹیشن تک جانا نہیں چاہتے تو۔

(جبار اسے گھور کر دیکھتا ہے)

کیا مجھے قانون کے حوالے کرنے کی کوئی اور صورت نہیں؟

جبّار: پہلی مرتبہ چوری کے لئے آئے ہو کسی کے گھر میں؟

اختر: جی ہاں!

جبار: تمہیں خبر تھی جو کچھ کرنے والے ہو اس کا کتنا بُرا انجام ہو گا؟

اختر: جی نہیں۔ میں یہ بات اس وقت سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور اب جبکہ ایسا واقعہ ہو گیا ہے میں بھاگنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں۔

جبار: چوری کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی تمہیں؟

اختر: آدمی چوری کیوں کرتا ہے؟

جبار: کسی قدر معقول چور معلوم ہوتے ہو!

اختر: یہ حُسنِ ظن ہے آپ کا۔

جبار: تعلیم یافتہ ہو؟

اختر: ایک حد تک!

جبار: پھر بھی چوری ایسا ذلیل کام کرنے کی کوشش کی۔

اختر: جب کسی شخص سے اس کا آخری سرمایۂ حیات بھی چھین لیا جائے تو وہ کیا کرے گا؟

جبار: کس طرح چھن گیا تمہارا سرمایہ؟

اختر: جس طرح عام طور پر چھینا جاتا ہے۔ جس دولت کو میں اپنی دولت کہہ سکتا تھا وہ بھی کسی نے لُوٹ لی، بتایئے میں کیا کر سکتا تھا۔ چوری کرنے کی کوشش نہ کرتا تو اور کیا کرتا؟

جبار: دوسروں کی دولت لوٹ کر تم اپنا سرمایہ پورا نہیں کر سکتے۔ یہ جرم ہے۔

اختر: میں نے جو کچھ سمجھا وہ غلط تھا۔ اور اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔

جبار: آئندہ کیا ارادہ ہے؟

اختر: جب اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ آئندہ کیا کرونگا۔

جبار: عجیب ہے یہ چکر، تمہاری دولت کسی اور نے لوٹ لی، تم میری دولت لوٹنا چاہتے تھے۔ خیر، میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔

(جبار الماری کھول کر اس میں سے نوٹوں کا بنڈل نکال کر لاتا

ہے اور اختر کے آگے پھینک دیتا ہے)

یہ رقم اٹھالو۔ شریفانہ کاروبار کے لئے کافی ہے۔ ممکن ہے اپنا سرمایہ دوبارہ حاصل کرلو۔

اختر: شکریہ آپ کی کرم فرمائی کا۔ مگر میں یہ رقم لوں گا نہیں۔

جبّار: کیوں؟

اختر: آج کی ناکامی نے مجھے یقین دلادیا ہے کہ کھوئی ہوئی دولت کے لئے کوشش کرنا فضول ہے۔ آپ کی یہ کم مہربانی نہیں کہ آپ نے مجھے آزاد کردیا ہے۔ میں جاسکتا ہوں۔

جبّار: تمہیں باہر چھوڑ آتا ہوں۔

(جبّار نوٹوں کا بنڈل اٹھالیتا ہے اور اختر کے ساتھ دروازے سے باہر نکل جاتا ہے اب سٹیج خالی ہے۔ چند لمحوں کے بعد زینو دروازے میں سے اندر جھانکتی ہے۔ اور پھر کمرے میں آجاتی ہے۔ جبّار دوبارہ داخل ہوتا ہے)

زینو: تھانے میں پہنچ گیا ہے چور؟

جبّار: (ستی اَن سنی کرکے) ناہید کہاں ہے؟

زینو: ادھر اپنے کمرے — میں لیٹی ہے۔ بلاکر لاؤں؟

(اس سے پہلے کہ جبّار کچھ کہے زینو تیزی سے نکل جاتی ہے۔ جبّار الماری کھول کر اس میں نوٹوں کا بنڈل رکھتا ہے — اور پھر دروازے کی طرف جانے لگتا ہے، زینو آتی ہے اور اس کے ساتھ ناہید بھی ہے۔ ناہید کا رنگ زرد پڑچکا ہے۔)

جبّار: کیوں ناہید! کیا ہوا تمہیں؟

زینو: بہت ڈر گئی ہے بیچاری!

جبّار: تمہیں اس کے آنے کی خبر کیوں کر ہوئی تھی؟

ناہید: جی! وہ — میں پیانو بجارہی تھی۔ یکایک مجھے محسوس ہوا جیسے اندھیرے

میں کوئی شخص کھڑا ہے۔

زینو: بے چاری کا بُرا حال ہو گیا ہے۔ ابھی کہہ رہی تھی میرا دل ڈوب رہا ہے۔

ناہید: ذرا لیٹ جاؤں گی تو ٹھیک ہو جائے گی طبیعت!

زینو: آپ ڈاکٹر کو کیوں نہیں بلا لیتے؟

جبّار: ڈاکٹر کو۔! (جبار دروازے میں سے نکل جاتا ہے)

زینو: کتنی بدشگونی ہوئی ہے آج ۔ تم اس قدر ڈر کیوں گئی ہو بی بی؟ کمینے کو آج ہی آنا تھا۔
اب جیل کی ہوا کھائے گا۔

ناہید: اوہ ——!

زینو: (گھبرا کر) کیا ہے بی بی؟

ناہید: کچھ نہیں، یونہی خراب ہو گئی ہے طبیعت ۔

زینو: ابھی آ جائے گا ڈاکٹر ۔ (جبار آتا ہے)

جبّار: مجھے تو غلط فہمی ہوئی تھی۔ بڑا عادی چور تھا۔

زینو: کیا ہوا ہے سرکار؟

جبّار: کم بخت نے آتے ہی ٹیلی فون کا تار کاٹ دیا تھا۔ تاکہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے
تو پولیس کو ٹیلی فون نہ کیا جا سکے۔

زینو: ٹیلی فون کا تار؟ اچھا ؟

(ناہید جانے لگتی ہے۔ جبار اس کی خون آلود انگلی دیکھ لیتا ہے)

جبّار: ناہید! یہ تمہاری انگلی کو کیا ہوا؟ خون کیوں بہہ رہا ہے اس میں سے؟

ناہید: خون! (انگلی کو دیکھتی ہے) مجھے خبر نہیں۔

زینو: جب میں یہاں سے کمرے میں گئی تو بی بی چھری سے کاٹ رہی تھی۔

ناہید: (پریشان سی ہو کر) میں نے ٹیلی فون کا تار نہیں کاٹا مجھے کیا خبر کس نے کاٹا ہے؟

(جبار خاموش رہتا ہے —— اور ناہید کو دیکھتا رہتا ہے)

جبّار: پریشان کیوں ہوگئی ہو اتنی سی بات پر ناہید ـــــ! دیکھو مائی! باورچی خانے کی الماری میں ٹنکچر کی بوتل پڑی ہے، لے آؤ۔ اور کوئی کپڑا بھی۔

زینو: بہتر سرکار!

(زینو کمرے سے نکل جاتی ہے۔ جبّار ناہید کے اور قریب آ جاتا ہے)

جبّار: (بڑے نرم لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر) تم نے ٹیلی فون کا تار کاٹ دیا۔ یہ اچھا کیا۔ بہت اچھا کیا تمہیں اس بات کا احساس ہوگا کہ ممکن ہے چور نے بہت مجبور ہو کر چوری کا اقدام کیا ہو اور میں غم و غصّے میں فون کر کے اسے پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ ہر چور مجرمانہ ذہنیت کا آدمی نہیں ہوتا۔ تم نے اسی نیک خیال سے تار کاٹا ہے اور مجھے مسرت ہے کہ تم نے ایسا کیا! اور دیکھو وہ چور بھی عجیب تھا۔ واقعی بہت عجیب (آواز میں لرزش) کہنے لگا جب کسی شخص کا آخری سرمایۂ حیات بھی چھن جائے تو وہ کیا کرے گا؟ مجبور تھا بے چارہ ـــــ کیوں ناہید؟

(ناہید خاموش رہتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں)

اوہو! تم تو رونے لگیں۔ اس میں بھلا رونے کی کیا بات ہے؟

ناہید: میں ـــــ میں نے ٹیلی فون کا تار کاٹ دیا تھا۔

جبّار: تو بہت اچھا کیا تھا نا! یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ آنسو پونچھ لو۔ زینو آ رہی ہے، کیا کہے گی؟

(ناہید دوپٹے کے دامن سے آنکھیں صاف کرتی ہے زینو بوتل لیکر آتی ہے)

دیکھو زینو! ٹنکچر لگا کر انگلی باندھ دو!

(جبّار دروازے کی طرف جاتا ہے)

زینو: آپ ڈاکٹر کو لینے جا رہے ہیں؟

جبّار: ہاں!

(جبّار کمرے سے نکل جاتا ہے۔ زینو ناہید کی انگلی پر ٹنکچر لگا کر پٹی باندھنے لگتی ہے۔ باہر سے موٹر کے سٹارٹ ہونے کی آواز آتی ہے)

زینو: بی بی! ٹیلی فون کا تار کیوں کاٹا تھا؟

(ناہید کوئی جواب نہیں دیتی، زینو اسے دیکھتی ہے مگر کچھ سمجھ نہیں سکتی)

اور یہ تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہیں؟

(ناہید بیزاری کے عالم میں سر ہلاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خاموش رہو)

اچھا بابا! تم جانو۔

(باہر موٹر کے رُکنے کی آواز آتی ہے)

لو آ گیا ڈاکٹر!

(جبّار اندر آتا ہے)

جبّار: مائی! تم جاؤ اپنے کمرے میں، سو رہو جا کر!

زینو: —— مگر ——

جبّار: کوئی فکر نہ کرو۔ جاؤ تم!

(زینو طوعاً و کرہاً اٹھتی ہے اور دروازے میں سے نکل جاتی ہے)

ناہید!

ناہید: جی!

جبّار: ناہید! میں نے چند روز ہوئے تم سے کہا تھا کہ جب سے تم آئی ہو میرے گھر میں اجالا ہو گیا ہے۔ مگر ناہید! میں کسی کے گھر کی روشنی چھین کر اپنے گھر کو منور کرنا نہیں چاہتا۔

(ناہید استفہام انگیز نظروں سے اسے دیکھتی ہے)

جاؤ —— باہر گاڑی میں اختر تمہارا انتظار کر رہا ہے!

ناہید: (کچھ سوجھتا نہیں کہ کیا کہے) آپ ——؟

جبّار: جاؤ ناہید! شاید یہاں بھی کبھی روشنی آ جائے اور نہ بھی آئے تو کیا حرج ہے۔ اس دنیا میں اجالا بھی رہتا ہے اور اندھیرا بھی —— جاؤ ناہید!

(جبّار ناہید کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف لے جانے لگتا ہے۔ ناہید کی

آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔

دونوں کمرے سے نکل جاتے ہیں۔

چند لمحوں کے بعد زینو آتی ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھتی ہے اور پریشان ہو کر آواز دیتی ہے "بی بی! سرکار! بی بی! کدھر گئے یہ لوگ!"

(پردہ گرتا ہے)

مُسافر

کِردار

روحی ....
ناہید- - - - - - - - .
صولت ....
نازی ....
خاور.. ... .
شمسہ... ... .

پہلا منظر

ایک خاموش وادی میں صولت خان کا مکان

یہ کمرہ سادہ اور مختصر ہے ۔ ایک کھڑکی جنوبی دیوار میں کھلتی ہے۔ کھڑکی میں سے جو منظر نظر آرہا ہے اس میں پہاڑیوں کا ایک سلسلہ اور درختوں کی بے شمار قطاریں نمایاں ہیں۔ کھڑکی سے پرے ایک پلنگ اور دو کرسیاں بچھی ہیں۔ ابھی شام نہیں ہوئی۔ پس منظر میں سورج غروب ہو رہا ہے۔

روحی اور ناہید کھڑکی کے سامنے کھڑی ہیں۔ روحی اٹھارہ بیس سال کی ایک صحت مند لڑکی ہے۔ ناہید اس سے دو تین سال بڑی نظر آرہی ہے۔

ناہید : روحی! مجھے حیرت ہے یہ لوگ اس خاموش وادی میں کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔

روحی : میرا خیال ہے بعض لوگوں کو پُر ہنگامہ زندگی سے پُر سکون زندگی زیادہ پسند ہوتی ہے ویسے یہ جگہ کافی خوبصورت ہے۔

ناہید : دن کے وقت تو مجھے بھی اچھی معلوم ہوتی تھی مگر اب تو میرا دل —

روحی : خوف زدہ ہو گیا ہے۔ یہی نا!

ناہید : ہاں!

روحی : پھر بھی ناہید! یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی پُر اسرار جزیرے

میں پہنچ گئی ہوں جہاں ملاحوں کے والہانہ گیت ان دیکھی چیزوں کا حال سنا رہے ہیں۔
مجھے تو الف لیلوی بغداد کی رومانی فضا یاد آ رہی ہے۔ کاش ہم یہیں رہیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے

ناہید: یہ سب کچھ ٹھیک سہی مگر یہ نہ بھولو کہ ہم یہاں صرف مہمان بن کر آئی ہیں۔

روحی: یہ بات کیوں کر بھول سکتی ہوں! (وقفہ)

ناہید: روحی!

روحی: (اپنے خیال میں غرق) ہوں!

ناہید: تم نے کچھ ٹھیک ہی کہا ہے۔ ماحول بڑا پُراسرار ہو گیا ہے۔ وہ دور دور تک چھائی ہوئی درختوں کی لمبی لمبی قطاریں اور ان کے اردگرد حدِ نظر تک پھیلا ہوا سلسلۂ کوہ، کیسا عجیب سماں ہے میرے ذہن پر تو ایک لرزش سی طاری ہے۔ اس خوابناک ماحول کی گہرائیوں میں نہ جانے کیسے کیسے راز چھپے ہوئے ہیں۔

روحی: اور یہ گھر کتنا پُراسرار ہے۔

ناہید: میں جب سے آئی ہوں یہی سوچ رہی ہوں۔

روحی: کون سی بات؟

ناہید: یہی کہ خالو جان اپنے مختصر سے خاندان کے ساتھ اس ویرانے میں کیوں کر رہتے ہیں؟

روحی: (سرگوشی کے سے انداز میں) ناہید! یہ بھی ایک راز ہے۔

ناہید: اور تم جانتی ہو؟

روحی: (توقف کے بعد) مجھے بھی خبر نہ ہوتی، مگر چند روز ہوئے خالہ جان کی ایک پرانی سہیلی سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ کافی دیر تک اس کے ساتھ رہنے کا موقعہ ملا۔ اس نے مجھے۔

ناہید: کیا ہے راز؟

روحی: ضرور بتاؤں گی، پر ذرا ٹھہرو۔

ناہید: کیوں؟

روحی: مجھے یہ معلوم کر لینے دو کہ اس وقت وہ دونوں کیا کر رہے ہیں۔

ناہید: دونوں اوپر ہیں، جب کوئی نیچے آتا ہے تو سیڑھیوں پر پاؤں کی آہٹ ضرور سنائی دیتی ہے۔ تو

روحی: تو — تم جانتی ہو کہ خالو جان ایک آرٹسٹ ہیں۔

ناہید: صرف یہ بات؟

روحی: نہیں۔ ہر آرٹسٹ یہ کب چاہتا ہے کہ وہ شہر کے ہنگاموں سے دور رہ کر کسی خاموش وادی میں زندگی بسر کرے؟

ناہید: ٹھیک ہے — پھر؟

روحی: یہ جگہ خالو جان کو نہیں ہماری خالہ جان کو پسند تھی۔

ناہید: خالہ جان کے متعلق تو کوئی بات بھی یقینی نہیں ہے۔

روحی: اپنے عزیزوں میں رہ کر بھی ان سے ہمیشہ الگ تھلگ رہی ہیں اور کوئی رشتہ دار بھی ان کو پوری طرح سمجھ نہیں سکا تاہم ناہید! کوئی شخص بھی اپنا راز ہمیشہ کے لئے چھپا نہیں سکتا اور یہی واقعہ ہماری خالہ جان کے ساتھ بھی پیش آیا۔ وہ بھی اپنی ایک سہیلی کے سامنے اپنے دل کا دروازہ کھولنے پر مجبور ہو گئیں۔

اور جب یہ دروازہ کھلا تو ——

ناہید: کیا ہوا؟

روحی: اس کے اندر ایک شخص مدت سے چپ چاپ سانس لے رہا تھا۔

ناہید: کون؟

روحی: کون —؟ یہی جو آج ہمارے خالو جان ہیں صولت خاں۔

ناہید: سچ؟

روحی: بالکل — خالہ جان کی سہیلی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ان کی ملاقات کسی تقریب پر ہوئی تھی۔ یہ رومان بڑی خاموشی سے چلتا رہا۔ کسی کو بھی اس کی خبر نہ ہو سکی۔

ناہید: عجیب بات ہے۔

روحی: خالہ جان دنیا کی ان ہستیوں میں سے ہیں جو اپنا زخم چھپا کر زندہ رہنے کا فن خوب جانتی ہیں۔ محبت نے ان کے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ مگر وہ ایک چٹان کی طرح پورے وقار کے ساتھ اپنی جگہ پر کھڑی رہیں۔ ایک وقت تو ایسا بھی آیا جب کامیابی کی کوئی صورت باقی نہ رہی تھی، اس عالم میں بھی خالہ جان پریشان نہ ہوئیں۔ خوش قسمتی سے ان کی سہیلی نے مدد کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شخص جو کئی سال پہلے چپ چاپ ان کے دل میں داخل ہو گیا تھا دولہا بن کر ان کے گھر میں آگیا اور

ناہید: اور ــــ؟

روحی: خالہ جان ایک خاموش وادی میں صاف ستھرے مکان کا خواب دیکھا کرتی تھیں۔ ان کے دولہا نے ان کا یہ خواب بھی پورا کر دیا۔

ناہید: لیکن روحی!

روحی: میں جانتی ہوں تم کیا پوچھنا چاہتی ہو۔ یہی کہ ان کے تعلقات کشیدہ کیوں ہیں؟

ناہید: میں صبح سے دیکھ رہی ہوں کہ خالہ جان خاموش پلنگ پر لیٹی ہیں۔ خالو جان کوئی بات پوچھتے ہیں تو جواب دے دیتی ہیں ورنہ خاموش رہتی ہیں۔

روحی: یہ بات میں نے بھی محسوس کی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو خالہ جان کی علالت ہے۔ بیماری میں آدمی اپنے آپ سے بھی بیزار ہو جاتا ہے۔

ناہید: کشیدگی کی یہ وجہ نہیں ہو سکتی۔

روحی: مدت ہوئی ان کا اکلوتا بیٹا فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ اب تک اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی کہ زندہ ہے یا مر چکا ہے یہ صدمہ معمولی صدمہ نہیں ہے اسی صدمے نے دونوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ جب میں نے خالہ جان کی غم میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کو دیکھا تو مجھے سخت افسوس ہوا، ان کا دل کتنا دکھی ہے کس قدر غم زدہ ہے۔

ناہید: خالو جان کا اپنا حال بھی تو بڑا دردناک ہے۔ کس قدر پریشان نظر آرہے تھے۔

روحی: دونوں دکھی ہیں بیٹے کی وجہ سے۔

(وقفہ)

ناہید: روحی! اب کھڑکی بند کر دو۔ سمندر کی بوجھل ہوائیں اندر آرہی ہیں۔

ناہید: (آہ بھر کر) ہائے شام کتنی خاموش ہے۔ شہر کی ہنگامہ پرور شام اور اس شام میں کتنا فرق ہے۔ ادھر سمندر کی طوفانی لہروں کا شور و شغب ہے اور ادھر خوابوں کے جزیرے کا سحر آلود سکوت۔ وہ دور چراغوں کے لرزتے ہوئے ننھے ننھے دائرے جگنوؤں کی طرح چمک رہے ہیں اور وہ چمکتے ہوئے پانی کے پاس ایک چھوٹی سی جھونپڑی ایک ناؤ کی طرح نظر آرہی ہے جو دور اُفق کے دامن میں غائب ہو رہی ہو۔

ناہید: روحی! مجھ پر تو ایک وحشت سی چھا گئی ہے۔ چلو اوپر خالہ جان کے پاس چلیں۔

روحی: نہیں ناہید! یہ مناسب نہیں ہے۔ تمہیں معلوم نہیں خالو جان نے خود کہا تھا بیٹیو! نیچے جاکر سو رہو۔

ناہید: میری سمجھ میں نہیں آتا یہ کیسی کیفیت ہے۔

(وقفہ۔ کسی قدر دور سے سیڑھیوں سے نیچے اترنے کی آواز)

روحی!

روحی: (اپنے خیال میں غرق) کیا ——؟

ناہید: کوئی آرہا ہے۔

روحی: کوئی —— آرہا —— ہے۔

ناہید: خالو جان ہیں۔

روحی: وہی ہیں۔

ناہید: اور کون ہو سکتا ہے۔

(صولت آتا ہے۔ ہاتھ میں ٹرے جس میں کافی کی پیالیاں رکھی ہیں۔

صولت پچاس کے لگ بھگ ہوگا۔ دراز قد۔ چہرہ مرجھایا ہوا۔ آواز بھاری)

صولت : روحی ! تم جاگ رہی ہو دونوں بہنیں ؟

ناہید : جی خالو خان !

صولت : میں نے کہا ذرا اپنی بیٹیوں کو دیکھ آؤں ۔ اگر جاگ رہی ہوں تو کافی کا دور ہو جائے گا ۔

ناہید : خالو جان ! آپ نے کیوں تکلیف کی ۔ خادمہ کو بھیج دیا ہوتا ۔

صولت : اس میں تکلیف کی کیا بات ہے ـــــ ہاں بیٹیو ! ڈر تو نہیں لگتا تمہیں ؟

روحی : مجھے تو خالو جان یہ سماں بڑا پیارا معلوم ہوتا ہے ۔

صولت : (ٹرے ایک طرف رکھ کر) میں جانتا ہوں تم گھبرا رہی ہو ۔ تم سے پہلے کئی مہمان آئے مگر ایک ہی رات گزار کر چلے گئے ۔ اب تو (آہ بھر کر) تمہاری خالہ بھی علیل ہے ۔

روحی : خالہ جان کا ہمیں بہت افسوس ہے ۔

صولت : میں دونوں نوکرانیوں کو یہاں بھیج دوں ؟

ناہید : نہیں خالو ! نوکرانیوں کو اپنے کمرے ہی میں رہنے دیں ۔ خالہ جان علیل ہیں آپ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ۔

صولت : میں تمہیں اوپر بھی سُلا سکتا تھا ۔ مگر آج کی رات یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا ۔ آج کی رات میں ہی تمہاری خالہ کے پاس رہوں گا ۔

روحی : (ذرا پریشان ہو کر) کیوں خالو میاں !

صولت : بیمار جو ہے وہ ۔ اور دیکھو لڑکیو ! کافی ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے اور یہ کھڑکی کیوں کھول رکھی ہے ؟

روحی : میں نے کھولی ہے باہر کا سماں بڑا پیارا معلوم ہوتا تھا ۔

صولت : یہاں رات کو ہوائیں بڑی سرد ہو جاتی ہیں ۔ اور کبھی کبھی باد و باراں کا طوفان بھی آ جاتا ہے ۔ اب کافی پی لو ۔

(روحی اور ناہید کانپتی ہیں) ۔

روحی : میں نے کہا خالو جان !

صولت : کہو بیٹی !

روحی : آج خالہ جان کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہے ۔

صولت : ہاں !

روحی : یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں مل سکتا ؟

صولت : تین میل کے فاصلے پر ایک ڈاکٹر ہے تو ضرور مگر اس کی ضرورت نہیں ہے ۔

ناہید : ڈاکٹر کی ضرورت کیوں نہیں خالو جان ؟

صولت : یہ میں جانتا ہوں ۔ اچھا شب بخیر ! کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے تکلف بتا دو ۔

روحی : کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں ہے ۔

صولت : آثار کہہ رہے ہیں کہ آج رات طوفان آئے گا ۔

ناہید : خالو جان ۔

روحی : خالہ جان کو تکلیف کیا ہے ، شاید انہیں اپنے بیٹے کی جدائی کا صدمہ ہے ۔ وہ اتنی دکھی کیوں نظر آ رہی ہیں خالو جان ؟

(صولت خاموش رہتا ہے)

ناہید : آپ آرام کیجئے ، خالو جان ! معاف کیجئے کبھی کبھی روحی بغیر سوچے سمجھے بھی بات کہہ ڈالتی ہے ۔

صولت : میری بیٹی نے کوئی بے جا سوال نہیں کیا ۔

روحی : آپ کو دکھ جو پہنچا ہے اس سے

ناہید : اچھا خالو جان ! شب بخیر ۔

صولت : میں اب خاموشی سے چلا جاؤں گا ۔ تو تم دونوں کے دلوں میں ایک الجھن سی رہے گی ۔ مجھے اصل حقیقت بتانا پڑے گی ۔

(وقفہ)

ناہید: آپ اس کی پروا نہ کیجئے

صولت: تمہیں اس کا علم نہیں کہ میری اور تمہاری خالہ کی شادی دراصل ایک دوسرے کے ساتھ گہری وابستگی کا نتیجہ تھی۔ ہم نے شادی سے پہلے محبت کے دُکھ بھی اٹھائے تھے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ ہماری شادی ہوگئی۔ تمہاری خالہ کی پرانی خواہش تھی کہ شادی کے بعد وہ شہر سے دُور پہاڑ کے دامن میں ایک خوبصورت سا مکان بنوا کر رہیں۔ ان کی یہ خواہش پوری ہوگئی۔ کچھ مدت کے بعد ایک اور ہستی بھی ہماری محبت میں شریک ہوگئی۔ یہ ہمارا اکلوتا بیٹا خاور تھا۔ خاور ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کا مرکز تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک دن۔

(صولت خاموش ہو جاتا ہے)

روحی: خالو جان؟

صولت: بتاتا ہوں بیٹی! ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ خاور ایک لڑکی غزالہ سے محبت کرتا ہے اور اسے رفیقۂ حیات بنانا چاہتا ہے۔ میں نے اس کی مخالفت کی۔

روحی: کیوں خالو جان؟

صولت: غزالہ وادی میں کافی بدنام لڑکی تھی۔ میں ایک بدنام لڑکی کو گھر میں لا کر خاندانی عزت کے ماتھے کو داغدار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تمہاری خالہ نے مجھے ہر چند یقین دلایا کہ غزالہ زندگی میں پہلی مرتبہ خلوص کے ساتھ محبت کر رہی ہے اور اب وہ پہلی جیسی نہیں رہی مگر (آہ بھر کر) خاندانی وقار کے خیال نے میرے دماغ میں زہر بھر دیا تھا۔ میں اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ خاور غزالہ سے نکاح کر کے اسے یہاں لے آیا۔ واقعات کی لہر گزر چکی تھی۔ مجھے خاموش ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن میں نے ایسا نہ کیا۔ اپنی محبوب بیوی نازی سے، اپنے بچے سے اور اپنی بہو سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ جوانی شوریدہ سر ہوتی ہے وہ تحمل سے کام لینا نہیں جانتی۔ آخر وہی ہوا جو میری اور نازی کی زندگی کا سب سے دردناک واقعہ ہے۔ خاور ایک

دن کسی کو اطلاع دیئے بغیر چلا گیا۔ اس کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ پورے سات سال گزر چکے ہیں۔ وہ فوج میں کبھی شامل نہیں ہوا۔ یہ بات خود میں نے اپنے عزیزوں کو سنائی تھی۔ تاہم میں اس کی طرف سے مایوس نہیں ہوں۔

روحی : عزالہ کا کیا ہوا؟

صولت : بیٹی! وہ خاور کی جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ کچھ مدت بیمار رہ کر چل بسی کاش میرا خاور آج رات آجائے۔ اگر آج کی رات بھی گزر گئی تو ———

(آواز بھرّا جاتی ہے)

روحی : تو —؟

صولت : اگر آج رات بھی وہ نہ آسکا تو اس گھر میں صرف اپنے منحوس باپ ہی کو دیکھ سکے گا۔ ماں کے پھیلے ہوئے پیار بھرے بازو اس کا خیر مقدم نہیں کر سکیں گے۔

ناہید : لہجے میں گھبراہٹ کیوں؟

صولت : بات یہ ہے بیٹی! آج رات تمہاری خالہ کی آخری رات ہے۔

ناہید اور روحی : (ایک ساتھ) آخری رات!

صولت : آج رات اس گھر سے ایک شخص ہمیشہ کے لئے جا رہا ہے۔ میں اپنے تصورات کے دھندلکے میں موت کے قدموں کی چاپ سن رہا ہوں۔ وہ آرہی ہے۔ وہ چلی آرہی ہے۔ ایک روح کو دبوچنے کے لئے ایک زندگی کی شمع بجھانے کے لئے۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں، جس رات عزالہ اس گھر سے ہمیشہ کے لئے جانے والی تھی اس رات بھی میں نے یہی کچھ محسوس کیا تھا۔ اس رات بھی دور سے ایک کتّے کے رونے کی آواز بار بار آتی تھی۔ اس رات بھی وہ سامنے کی پہاڑی کے اوپر دمکتا ہوا ستارہ دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا تھا۔ یہ آثار کہہ رہے ہیں کہ آج رات بھی وہی ہو گا جو آج سے چھ سال پہلے ہو چکا ہے۔ میری نازی۔ میری محبوب بیوی بیٹے کا انتظار کرتے کرتے چلی جائے گی۔ کاش میرا خاور آجائے۔ اگر میں اپنی زندگی دے کر بھی اپنے بیٹے کو بلا سکتا

تو یہ سودا ضرور کرتا۔ نازی چپ چاپ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دروازے کو دیکھتی رہتی ہے اور میرے دل پر آرے چل رہے ہیں

(وقفہ)

اچھا بیٹیو! میں جاتا ہوں۔ اب تم سو رہو۔ کھڑکی بند کر لینا۔ شاید طوفان آئے۔ خدا حافظ!

(تھوڑے سے وقفے پر کتے کے رونے کی آواز آتی ہے صولت کمرے سے نکل جاتا ہے۔)

ناہید: روحی!

روحی: ہوں!

ناہید: یہ سب کچھ کتنا عجیب ہے۔

روحی: یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی ایک خواب دیکھ رہی تھی۔

ناہید: آج کی رات خالو بڑے دکھی ہیں، اگر خالہ اپنے بیٹے کو دیکھے بغیر مر گئیں تو انہیں کتنا دکھ ہوگا۔ بھری دنیا میں تنہا رہ جائیں گے۔ ان کی زندگی کس قدر حسرت ناک ہوگی۔

روحی: ناہید!

ناہید: کہو!

روحی: میرا جی چاہتا ہے اوپر جا کر خالہ کو آخری بار دیکھ آؤں۔ آخری بار انہیں آنکھیں جھپکاتے۔ سانس لیتے، باتیں کرتے دیکھ لوں۔ اس کے بعد تو موت کا سرد ہاتھ ان کی زندگی کی آخری رمق بھی چھین لے گا۔

ناہید: جی تو میرا بھی چاہتا ہے مگر اوپر جانا مناسب نہیں۔

روحی: میں کہہ دوں گی جب تک کچھ پڑھ نہ لوں مجھے نیند نہیں آتی۔

ناہید: یہ تمہاری عادت ہے بھی!

روحی: چلیں۔

ناہید : (کھڑکی سے باہر دیکھ کر) کتنا پُراسرار ماحول ہے اس وقت۔

دوسرا منظر

(نازی کا کمرہ پہلے کمرے کی طرح سادہ، کل سامان ایک کوچ تین کرسیاں، ایک تپائی اور پلنگ۔ دیوار کے ساتھ پلنگ کے اوپر نازی لیٹی ہے۔ سن پینتالیس کے قریب ہوگا۔ چہرہ زرد، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اس کے سامنے صولت کھڑکی میں کھڑا باہر دیکھ رہا ہے۔ نازی ٹکٹکی باندھے دروازے کی طرف دیکھ رہی ہے۔)

(دروازے پر دستک ہوتی ہے۔)

نازی : (آواز میں نقاہت) میں نے کہا دیکھو دروازے پر کون ہے۔ روحی اور اس کی بہن ہوگی۔ ڈر گئی ہیں بچیاں۔ (کھانستی ہے) میں نے کہا اُدھر کیوں کھڑے ہو؟

صولت : (بدستور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے) کچھ مجھے کہا نازی! ———— ابھی تو وہ بہت دور ہے۔

نازی : کون بہت دور ہے؟

صولت : جسے آج آنا چاہیئے۔ جو آج رات ضرور آئے گا۔

نازی : دروازہ تو کھولو۔

(صولت دروازہ کھولتا ہے۔ ناہید اور روحی آتی ہیں)

روحی : معاف کیجئے خالہ جان!

نازی : ڈر گئیں نا۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ نوکرانیوں کو اپنے پاس بلا لو۔ دوسرے کمرے میں ہیں۔ بُلا لو۔

روحی : یہ بات نہیں خالہ جان! میں سونے سے پہلے کسی کتاب کا مطالعہ ضرور کیا کرتی ہوں اور پڑھتے پڑھتے سو جایا کرتی ہوں۔

(صولت پھر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے)

نازی : روحی بیٹی ! وہ دیکھو الماری میں کتابیں موجود ہیں۔ جو پسند آئے لے جاؤ۔

روحی : شکریہ خالہ جان !

(روحی الماری کی طرف جاتی ہے۔ مگر نظر نازی پر جمی ہے۔ ایک کتاب نکال کر نازی کے پاس آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔)

نازی : میں نے کہا صولی !

صولت : کیوں نازی !

نازی : تم کیا کر رہے ہو وہاں کھڑکی کے پاس ؟ سردی بڑھتی جا رہی ہے۔

صولت : (کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے) میں کچھ دیکھ رہا ہوں۔ دور روشنی کا ایک ننھا سا دائرہ نظر آ رہا ہے۔ یہ چوکیدار کی لالٹین کی روشنی ہے۔ جب کبھی اس وادی میں رات کے وقت کوئی مسافر راستہ بھول جاتا ہے تو وہ لالٹین لے کر اسے منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔ شاید ہمارا بھولا بھٹکا مسافر بھی ادھر آ نکلے۔

نازی : خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو۔ کیوں میرے زخموں پر نمک چھڑکتے ہو۔

صولت : نازی ! میں بھی تمہاری طرح اپنے بیٹے کے لئے بیتاب ہوں۔ خاور کی جدائی میں ایک ایسے پرندے کی طرح دن بسر کر رہا ہوں جو شام کی تاریکی میں اپنے گھونسلے کا راستہ بھول جائے اور چیخ چیخ کر ادھر اُدھر اڑتا پھرے۔

نازی : کاش ! تم نے اس وقت اپنے بیٹے سے دشمنی نہ کی ہوتی۔

صولت : مجھے اپنے کئے کی سزا مل چکی ہے۔

نازی : خدارا کھڑکی سے ہٹ جاؤ۔ کمزوری کی وجہ سے پہلے ہی دل کے دورے پڑتے ہیں۔

ناہید : اِدھر آ جائیے کوچ پر خالو جان !

صولت : چوکیدار کی لالٹین کچھ اور آگے بڑھ آئی ہے۔ وادی میں کوئی نہ کوئی ضرور آیا ہے۔

نازی : کھڑکی سے ہٹ بھی جاؤ۔ مجھے نہ ستاؤ۔

روحی : خالو جان!

صولت : لالٹین آگے بڑھتی آرہی ہے۔ چوکیدار کے پیچھے کوئی شخص چلا آرہا ہے۔ دو سائے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔

(تیز ہوا سے کھڑکیوں کے پٹ آپس میں ٹکراتے ہیں)

نازی : ہائے کتنی ٹھنڈی ہوا ہے۔ کیوں اپنی جان کے ساتھ دشمنی کر رہے ہو۔

صولت : کیا خبر وہ آرہا ہو۔

نازی : (اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے) کتنا دکھ دیتے ہو تم۔ ہائے۔

روحی : (جلدی سے آگے بڑھ کر) نہیں خالہ جان! یہ ظلم نہ کیجیے۔

نازی : دیکھو وہ سنتا نہیں ہے۔ ساری عمر ضدی رہا ہے۔ پتھر، بے حس۔

روحی : خالو جان! آپ الگ ہو جائیں نا — کوچ پر آ بیٹھئے۔

صولت : لالٹین —

نازی : (پیشانی پر ہاتھ رکھ کر) دیکھا —— ہائے!

روحی : خالو جان!

نازی : کھڑکی بند کر دو۔

صولت : (کھانستے ہوئے) مجھے دیکھنے دو! (دل پر ہاتھ رکھتا ہے) اوہ!

(روحی کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر دیتی ہے۔ دور سے گھڑیال کی آواز آتی ہے۔ صولت ابھی تک کھڑکی کے پاس کھڑا ہے)

کمرے میں اتنا اندھیرا کیوں ہو گیا ہے؟

روحی : بجلی تو جل رہی ہے خالو جان!

ناہید : خالو جان! خاور کو اپنا گھر معلوم ہے؟

صولت : پچھلے چھ سات سال میں یہاں کئی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ وادی میں آنے کا اب

ایک نیا راستہ بنایا گیا ہے جو بڑا پیچیدہ ہے۔

روحی : خالو جان! بیٹھ جائیں نا!

(صولت اپنے آپ کو کوچ میں گرا دیتا ہے)

صولت : کیا آگیا میرا بھولا بھٹکا مسافر!

نازی : تم آرام کرو۔ کوئی نہیں آیا۔ کوئی نہیں آئے گا۔

صولت : نہیں وہ آرہا ہے، میرا دل کہتا ہے وہ آرہا ہے۔ وہ آرہا ہے۔

(صولت بمشکل سر اٹھاتا ہے۔ پھر کوچ کے بازو پر سر رکھ دیتا ہے)

نازی : لڑکیو! تم کھڑی کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔

(روحی اور ناہید کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں)

روحی : خالو نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔

ناہید : سو گئے ہیں۔

(نیچے دروازے پر دستک)

روحی : نیچے دستک ہو رہی ہے۔

نازی : (پکار کر) شمسو! نیچے جاؤ۔

شمسہ : (دوسرے کمرے سے) اچھا بی بی۔

(وقفہ۔ شمسہ بھاگی بھاگی جاتی ہے۔ پھر جلدی واپس آجاتی ہے)

نازی : کیا ہے شمسو؟

شمسہ : بابو آگیا ہے — بابو۔

(خاور آتا ہے۔ بیس بائیس برس کا نوجوان، کپڑے پھٹے ہوئے)

نازی : میرے لال، میرے بچے! (بازو پھیلا دیتی ہے)

خاور : اماں!

(خاور ماں سے لپٹ جاتا ہے)

نازی: صولی: صولی!

(صولت بے حس و حرکت پڑا ہے)

روحی: (صولت کا ہاتھ پکڑ کر) خالو جان! (ایک دم چیخ مار کر) ہائے خالو جان خالو جان! خالو جان کو کیا ہو گیا ہے؟ خالو جان!

(دور سے کتے کے رونے کی آواز آتی ہے۔ ہوا چیخ چیخ کر کھڑکی سے ٹکرا رہی ہے)

رقصِ شرر

کردار

سہیل .. .. ایک شاعر

محمود ... ... سہیل کا دوست

شہاب. .. .. سہیل کا دوست

منظر

(ایک دالان۔ عام کمرے جتنا بڑا۔ شمال میں کوٹھڑی، دونوں پٹ بند، ایک دروازہ جنوبی گوشے میں، جس کی دوسری طرف بازار ہے جس وقت پردہ اٹھتا ہے ہم کوٹھڑی کے دروازے کے سامنے ایک میلی کچیلی پھٹی پرانی دری کے اوپر سہیل کو بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں۔ دری کے اوپر چاروں طرف گرد آلود کتابوں کے کئی انبار۔ ایک طرف قلم دوات، کچھ کاغذات اور ایک پنسل ہے۔ سہیل کی عمر پینتیس سال سے زائد نہیں۔ مگر نحیف و نزار ہونے کی وجہ سے بوڑھا نظر آتا ہے۔ اس وقت کرتے، پاجامے اور واسکٹ میں ملبوس ہے۔ سامنے انگیٹھی ہے جس کے کوئلوں کو پنکھا جھل جھل کر سرخ کر رہا ہے کچھ کوئلے سرخ ہو چکے ہیں۔ اور کچھ ابھی سیاہ ہیں۔ دری سے کچھ دور ایک تپائی کے پاس ایلومینیم کی دو کیتلیاں، دو پیالیاں، تین چمچ، ایک دیگچی، ایک مٹی کا گھڑا اور کچھ پڑیاں ہیں۔

وقت: دسمبر کا ایک دن، تیسرے پہر کا آغاز۔ ہوا میں تندی۔

یکایک کوٹھڑی میں سے کھوں کھوں کی آواز آتی ہے۔ سہیل کا ہاتھ رک جاتا ہے۔ اور کوٹھڑی کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔ " لاتا ہوں بھائی، ابھی کوئلے سرخ نہیں ہوئے۔"

فضا میں خاموشی چھا جاتی ہے۔ جنوبی دروازے کے دونوں پٹ زور سے ٹکراتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ہوا تیز ہوگئی ہے۔ بارش ہونے والی ہے۔ ایک آدھ منٹ کے بعد کھانسی کی آواز پھر آتی ہے۔ سہیل اپنی جگہ سے اٹھتا ہے اور گھڑے کے پانی سے پیالی بھرتا ہے، اور کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اندر چلا آتا ہے اور پھر کوٹھڑی کے دونوں پٹ جلدی سے بند کر دیتا ہے۔ اب سٹیج پر کوئی نہیں ہے۔ دروازے کے پٹ ٹکراتے ہیں۔ محمود آتا ہے۔ سہیل کا ہم عمر مگر صحت کے لحاظ سے بہتر۔ لباس، پاجامہ اور شیروانی۔ رخساروں اور سر کے گرد مفلر لپٹا ہوا۔ ہاتھ میں چھڑی جسے وہ دالان میں داخل ہوتے ہی دیوار کے ساتھ کھڑی کر دیتا ہے۔ ادھر اُدھر دیکھتا ہے اور کسی سے مخاطب ہوئے "بغیر کہاں گئے یہ لوگ" یہ الفاظ کہہ کر کتابوں کا انبار ایک طرف ہٹا کر دری کے ایک سرے پر بیٹھ جاتا ہے۔

سہیل آتا ہے کوٹھڑی کے دونوں پٹ بند کر دیتا ہے اور محمود کو دیکھتا ہے۔

سہیل: محمود! بھئی بہت خوب۔ اچھے وقت پہ آئے ہو۔ کب آئے جہلم سے؟

محمود: ابھی ابھی گاڑی سے اترا ہوں۔ باہر بلا کی سردی ہے۔ توبہ (انگیٹھی کے قریب کھسکتے ہوئے) شہاب کا کیا حال ہے؟

سہیل: ویسے کا ویسا۔

محمود: ویسے کا ویسا۔ کیوں؟

سہیل: پہلی سی بے چینی تو نہیں۔ تاہم کمزوری بڑھتی جارہی ہے۔ بھئی شیروانی اتار کر بیٹھو آرام سے (پنکھا جھلتے ہوئے) کوئلے سرخ ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ گھنٹہ بھر سے پنکھا جھل رہا ہوں۔

محمود: میں نے کہا (سرگوشی کے انداز میں) کوئی فکر کی بات نہیں ہے نا۔

سہیل: ہوسکتی ہے اور نہیں بھی۔

محمود: تاہم۔

سہیل: تاہم۔ کیا کہوں۔ یار مصیبت یہ ہے علاج ولاج کے لئے معقول پیسوں کی ضرورت ہے اور یہاں (آہ بھر کر) جو حال ہے جانتے ہو۔ جتنے پیسے تھے۔ سب کے سب خرچ ہو گئے ہیں۔

محمود: (لہجے میں شرمندگی کا دبا دبا احساس، یاروں کی بھی یہی حالت ہے۔

سہیل: عجیب احمق ہو۔ تمہیں کس نے کہا ہے، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، انتظام ہو جائے گا۔

محمود: کس قسم کا۔

سہیل: ایک نظم کہی ہے، بڑی طویل۔ اور بڑی رومانی۔ ابھی مکمل نہیں ہو سکی، خیر آج ایڈیٹر کے پاس لے جاؤں گا اور پیسے لے آؤں گا۔ ایک دو دن میں بقیہ حصہ بھی مکمل کر کے دے دوں گا۔

محمود: ہاں خط میں تم نے لکھا بھی تھا کہ ایک طویل نظم کہہ رہا ہوں۔ وہی نظم ہے کیا؟

سہیل: بالکل وہی (لہجے میں ایک اُمنگ اور تیقن) عجیب رومانی نظم ہے۔ میں سمجھتا ہوں ایسی دلآویز اور خوب صورت نظم میں آج تک نہیں کہہ سکا۔ لوگ میرے پچھلے کارنامے بھول جائیں گے یہ نظم پڑھ کر۔

محمود: واقعی!

سہیل: تو کیا جھوٹ کہوں گا تم سے۔ اپنی طرف سے تو میں نے سارا زورِ قلم ختم کر دیا ہے محبت کے عہدِ رنگیں کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ جو بھی سنے گا اسے اپنی ہی داستانِ محبت سمجھ لے گا۔ خواہ اس نے عمر بھر محبت نہ کی ہو۔

محمود: پھر تو واقعی عجیب چیز ہے۔

سہیل: بس ایک ہی نقص ہے —— مکمل نہیں کر سکا۔ چاہتا ہوں، آخری حصہ بھی ویسا ہی زوردار ہو جیسے باقی حصے ہیں۔

(کوٹھڑی سے آواز آتی ہے "سہیل" مگر دونوں اپنی گفتگو میں محو ہیں)

محمود: ایڈیٹر معاوضہ دے گا اس صورت میں ——؟

سہیل: اجی نظم سن کر پھڑک اٹھے گا۔ ابھی مکمل نہیں تو کیا ہوا۔ وہ ایک روز میں مکمل ہو جائے گی۔

(کوٹھڑی سے دوبارہ نحیف سی آواز "بھئی سہیل" اب کے بھی دونوں بے خبر رہتے ہیں)

محمود: کتنے دنوں میں لکھی ہے؟

سہیل: یہ نہیں کہہ سکتا۔ پچھلے کئی دنوں اور کئی راتوں سے اسی فکر میں غلطاں ہوں۔ نظم کی محرک بھی ایک عجیب چیز ہوئی ہے۔ ایک دن شہاب مایوسی اور دل شکستگی کے عالم میں ستار بجا رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خیال آگیا اور اسی وقت چند مصرعے سوجھ گئے۔ اور پھر یہ سلسلہ جاری ہو گیا۔

(اندر سے تیسری بار آواز "کیا ہو گیا ہے بھائی، کانوں میں روئی ٹھونس رکھی ہے کیا؟")

محمود: ٹھہرو تو —— (کوٹھڑی کی طرف دیکھتا ہے)

سہیل: کیا ہوا؟

محمود: شہاب نے کچھ کہا ہے!

سہیل: وہ تو —— میرا خیال ہے غنودگی کی حالت میں تھا —— کیا کم بختی ہے، انگیٹھی بھی اندر لے کر نہیں گیا!

محمود: لے جاؤ اور دیکھو۔

(سہیل انگیٹھی لے کر اندر جاتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد انگیٹھی اٹھائے واپس آجاتا ہے)

سہیل: کہتا ہے تین چار آوازیں دیں۔ ہم نے تو کچھ بھی نہیں سنا۔ سنا تھا تم نے!

محمود: ضرور آوازیں دی ہوں گی اس نے (آہ بھر کر) عجیب حالت ہے ہم لوگوں کی بھی۔ جب کبھی اپنی تخلیقات کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں تو یہ احساس ہی نہیں رہتا کہ پاس ہی کوٹھڑی میں ایک بیمار دوست بار بار ہمیں بلا رہا ہے۔

سہیل: (آہ بھر کر) درست کہتے ہو فن کاروں کی یہ ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔

محمود: یہ انگیٹھی واپس لے آئے ہو؟

سہیل: کہتا تھا، یہاں سردی نہیں ہے۔ محمود اتنی سردی میں اتنی دور سے آیا ہے اسے مجھ سے زیادہ ضرورت ہے (موضوع بدلتے ہوئے) یہ کہو کاروبار کا کیا عالم ہے۔؟

محمود: کاروبار کا عالم — کیا پوچھتے ہو۔ آج کل کوئی نئی کتابیں بھی نہیں خریدتا۔ پرانے نسخوں کی طرف کون دیکھتا ہے بھلا۔ پچھلے تین ماہ میں تین قلمی کتابیں بکی ہیں، اور یہ تینوں کی تینوں لائبریریوں کے لئے خریدی گئی ہیں۔

(دروازے کے پٹ آپس میں ٹکراتے ہیں)

سہیل: طوفان آنے والا ہے اب تک مجھے چلے جانا چاہیئے تھا۔ اچھا ہوا تم آگئے۔

محمود: کہاں جاؤ گے اتنی سردی میں؟

سہیل: نظم کو ٹھکانے لگانے اور کہاں!

محمود: کل کسی وقت سہی۔

سہیل: نہیں بھئی۔ ایڈیٹر کو خط لکھ چکا ہوں۔ اور پھر شہاب کے لئے دوا دارو کا بھی بندوبست کرنا ہے۔ آخر کہاں سے آئیں گے پیسے۔ تم یہاں ہو تو فکر کی کیا بات ہے۔ وہ دیکھو (میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) سامنے چائے کا سب سامان موجود ہے، مزے سے چائے بنانا اور پینا۔

محمود : ایک آدھ پیالی پی کر جاؤ

سہیل : نہیں بھئی۔

(محمود اپنا مفلر اتار کر اسے دیتا ہے)

محمود : یہ مفلر لپیٹ لو۔ شیروانی اتار دوں، باہر تو بڑی سردی ہوگی۔

سہیل : شیروانی کی ضرورت نہیں۔ یہی کافی ہے۔

(سہیل مفلر گردن کے گرد لپیٹ لیتا ہے)

محمود : ذرا جلدی آ جانا۔

سہیل : میری تو یہی کوشش ہوگی، ہاں جب تک میں آؤں تم یہیں بیٹھے رہنا۔ میرا خیال ہے چائے بنانے کی ضرورت نہیں ہوگی، کیتلی میں کچھ ہوگی۔ گرم کر لینا۔

محمود : بہتر، جاؤ!

(سہیل کاغذ اٹھاتا ہے اور جنوبی دروازے کی طرف جانے لگتا ہے۔ جب وہ چلا جاتا ہے تو محمود اپنی جگہ سے اٹھتا ہے، کیتلی اٹھا لاتا ہے اور اسے انگیٹھی پر رکھ دیتا ہے، انبار میں سے ایک کتاب نکالتا ہے پھونک مار کر اس کی جلد سے گرد ہٹاتا ہے اور پھر ورق گردانی کرنے لگتا ہے۔

کوٹھڑی کے دونوں پٹ آہستہ آہستہ کھلتے ہیں۔ شہاب کھانستے ہوئے باہر آتا ہے۔ شہاب چالیس بیالیس برس کا ایک نحیف و نزار شخص ہے میلی چکٹ رضائی میں لپٹا ہوا۔ سر پر اونی ٹوپی)

شہاب : بھئی کیا حال ہے؟ ہائے اللہ (کھانسی روکنے کیلئے چھاتی پر ہاتھ رکھتا ہے)

محمود : شہاب! تمہیں اندر ہی رہنا چاہیئے۔

شہاب : اندر ہی رہنا چاہیئے پر کیا کروں۔ تنہائی میں وحشت ہوتی ہے سہیل چلا گیا ہے؟

(دری پر بیٹھ جاتا ہے)

محمود: ابھی ابھی گیا ہے۔

شہاب: اگر تکلیف نہ ہو تو میرا تکیہ لادو۔ چارپائی کے اوپر پڑا ہے۔

(محمود کوٹھڑی کے اندر جاتا ہے۔ اور تکیہ لے کر واپس آجاتا ہے)

محمود: لو۔ لیٹو گے یا پیٹھ کے پیچھے رکھ دوں؟

شہاب: پیٹھ کے پیچھے ذرا سہارا چاہیئے۔

(محمود تکیہ شہاب کی پیٹھ کے پیچھے دیوار کے ساتھ لگا دیتا ہے)

بس شکریہ! — کاروبار کا حال سناؤ۔

محمود: کاروبار تو ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے۔ کوئی اور دھندا کرنے کی فکر میں ہوں۔

شہاب: (مسکراتے ہوئے) ہم لوگ کوئی اور دھندا کر بھی سکتے ہیں؟ (کھانسی کا زور) توبہ!

محمود: جاؤ بھئی اندر جا کر لیٹ رہو۔ باہر سردی میں کھانسی بڑھ گئی ہے۔

شہاب: وہاں تو بڑی وحشت ہوتی ہے۔ رات دن وہی تنگ و تاریک کوٹھڑی اور وہی چھوٹی سی چارپائی۔ آدمی گھبرا نہ جائے تو اور کیا ہو!

محمود: لیکن یہاں سردی جو زیادہ ہے۔

شہاب: کوئی خاص سردی نہیں۔

محمود: تمہیں کیا معلوم، باہر طوفان آرہا ہے۔

شہاب: سہیل بیچارے کی کیا حالت ہوگی؟ کتنی تکلیف اٹھا رہا ہے میری خاطر۔

محمود: (موضوعِ گفتگو بدلتے ہوئے) سنا ہے بڑی معرکہ آرا نظم کہی ہے اس نے۔

شہاب: لاجواب چیز ہے (کھانستا ہے) تھوڑا سا پانی لادو بھائی۔

(محمود گلاس میں پانی لاتا ہے)

محمود: ابھی اس طرح تو کھانسی بڑھ جائے گی۔ اندر وحشت ہوتی ہے تو چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ اندر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔

شہاب: اندر تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قبر میں بند کر دیا گیا ہوں۔ ابھی زندہ ہوں تو یہ قید

برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ کیا ہے کیتلی میں ؟

محمود : چائے، پیو گے نا۔

شہاب : چائے پینے سے کس کافر کو انکار ہو سکتا ہے۔ دودھ مل گیا ہے کیا۔ کم ہے تو لے آؤ اندر میری چارپائی کے پاس دیگچی میں پڑا ہے۔

محمود : دودھ کی ضرورت نہیں۔ بنی بنائی چائے مل گئی ہے۔ گرم کر رہا ہوں۔ بس ہو گئی ہے۔ ابھی دیتا ہوں۔

(محمود پیالی میں چائے ڈال کر اسے دیتا ہے)

شہاب : (پیالی ہونٹوں سے لگاتے ہوئے) واہ وا، خوب گرم اور لذیذ ہے۔ واللہ سرور آگیا ہے۔

محمود : اچھا!

شہاب : اب ایک اور کام کرو تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو جائے۔

محمود : کون سا کام؟

شہاب : اندر میری ستار پڑی ہے۔ سرہانے کی طرف تپائی کے اوپر۔

(چائے کے لمبے لمبے گھونٹ حلق میں انڈیلتا ہے)

محمود : لا دوں ؟

شہاب : ہاں۔ جب سے یہ حال ہوا ہے اسے کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ ذرا احتیاط سے اٹھانا۔

محمود : اس کی فکر نہ کرو۔

(محمود دوبارہ کوٹھڑی کے اندر جاتا ہے۔ اور جب باہر آتا ہے تو اس کے ہاتھ میں ستار ہے)

شہاب : لے آئے، شکریہ! — آ میری دمساز (ستار گود میں رکھ لیتا ہے) تو نہ ہو تو زندگی کتنی بے کیف ہو جائے — کس قدر بے رنگ ہو جائے۔

محمود : چائے اور پیو گے۔ ابھی کافی ہے۔

شہاب: نہیں بھائی بس۔ آج تو سینے میں ایک ہلچل سی مچی ہے۔ صرف میری ستار ہی سکون دے سکتی ہے۔

(محمود چلائے پیتا ہے اور کن انکھیوں سے اسے دیکھتا بھی جاتا ہے شہاب اپنی انگلیاں ستار کے تاروں پر پھیرنے لگتا ہے ایک میٹھا سا نغمہ بیدار ہو کر فضا میں لہرانے لگتا ہے آہستہ آہستہ اس کی انگلیوں کی حرکت تیز ہونے لگتی ہے)

محمود: (ہاتھ کے اشارے سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے) شہاب! ذرا آہستہ تھک جاؤ گے بھائی۔

شہاب: تم نہیں جانتے، میرے دل کی گہرائیوں میں آج کیا ہو رہا ہے کتنی ہلچل مچی ہے۔ کیسا طوفان اُمنڈ رہا ہے۔

محمود: تھک جاؤ گے، اور اس سے طبیعت پر بُرا اثر پڑے گا۔

(شہاب اس کا جواب نہیں دیتا۔ اس کی انگلیوں کی حرکت اور تیز ہو جاتی ہے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد محمود اسے دوبارہ ہاتھ کے اشارے سے روکتا ہے۔ شہاب اس مرتبہ بھی توجہ نہیں کرتا۔ اچانک ستار کے دو تین تار ایک جھنکار کے ساتھ ٹوٹ جاتے ہیں۔ جھنکار آہستہ آہستہ فضا میں ڈوب جاتی ہے۔ شہاب کی آنکھوں کے پپوٹے ایک دم پھیل جاتے ہیں۔ جیسے اسے اس حادثے کا کبھی وہم و گمان بھی نہیں تھا)

محمود: آخر وہی ہوا نا جس کا اندیشہ تھا۔

شہاب: (اس حادثے کی نوعیت کو نہ سمجھتے ہوئے) کیا ہوا؟

محمود: ستار کے تار ٹوٹ گئے ہیں۔

شہاب: (شکستہ تاروں کو گھورتے ہوئے) تار ٹوٹ گئے ہیں۔

محمود: لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اور آ جائیں گے بازار سے۔ تار ہی ٹوٹے ہیں ستار تو نہیں ٹوٹی۔

شہاب: (لہجے میں گہرا درد) آخر ساتھ چھوڑ کر چلی گئی۔ زندگی کے بڑھتے ہوئے اندھیرے سے گھبرا کر رخصت ہو گئی۔

محمود: کیسی باتیں کر رہے ہو شہاب۔ آخر ہوا کیا ہے۔

شہاب: میری زندگی کا سب سے المناک حادثہ!

محمود: صرف تار ٹوٹ جانے سے۔

شہاب: تم اس حادثے کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس کا ہر تار میری زندگی کی ایک کڑی ہے۔ اور آج چند کڑیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ آج کتابِ حیات کے چند ورق پھٹ گئے ہیں آج میری امیدوں کا ہار ٹوٹ گیا ہے، آج ـــــ

محمود: میری سمجھ میں نہیں آتا تم کیا کہہ رہے ہو۔ آخر اس پاگل پن کا مطلب کیا ہے۔

شہاب: اس پاگل پن کو تم نہیں سمجھ سکتے، کیوں کہ تم صرف کتابیں بیچتے ہو، لکھتے نہیں ہو۔ تم خود فن کار نہیں ہو۔ تمہیں کیسے بتاؤں کہ ایک انسان زندہ رہنے کے لئے کیسے کیسے سہارے ڈھونڈتا رہتا ہے اور جب یہ سہارے ختم ہو جاتے ہیں تو اس کی زندگی اس کے لئے کس طرح وبالِ جان ہو جاتی ہے۔ اس وقت میری کیا کیفیت ہے۔ کاش تم سمجھ سکتے۔ کاش میں تمہیں سمجھا سکتا۔

محمود: تم اپنی ستار مکمل چاہتے ہو نا، تمہیں مکمل حالت میں مل جائے گی۔

شہاب: لیکن یہ تار ـــ یہ تار کیوں کر زندہ ہوں گے؟

محمود: ان کی بجائے نئے تار لگ جائیں گے!

شہاب: نئے تار لگ جائیں گے مگر نغمے کی وہ روح کہاں سے آئے گی جو ان شکستہ تاروں کے سینے میں پرفشاں تھی۔ محمود! یہ روح میری اپنی روح تھی یہ ختم ہو گئی تو سب کچھ ختم ہو گیا۔

محمود: لاؤ اندر رکھ آؤں۔ تم تو خواہ مخواہ وہموں میں گرفتار ہو گئے ہو۔

شہاب: نہیں میں اسے اپنی آنکھوں سے دور نہیں کر سکتا۔ یہ میرے سامنے رہے گی۔
محمود: تمہارے سامنے رہے یا تمہاری آنکھوں سے اوجھل بہر حال اس کا تذکرہ ختم کرو۔
شہاب: شکستہ تاروں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے، زندگی کے ہر مرحلے اور ہر منزل پر اس نے میرا ساتھ دیا تھا۔ میری ہمدرد اور غمگسار تھی، میرے ماضی کے بہترین لمحوں کا سرمایہ اس کے پہلو میں محفوظ پڑا تھا۔ آج افسوس مایوس ہو کر موت کی تاریک وادیوں میں چلی گئی۔ اب ان وادیوں سے کبھی واپس نہیں آئے گی۔ کبھی واپس نہیں آسکے گی۔
محمود: شہاب!
شہاب: (اپنے خیال میں) اس نے مجھے زندہ رہنے کا حوصلہ دیا تھا میرے اندر زندگی سے پیار کرنے کی اُمنگ بھر دی تھی۔ اور پھر اس نے مجھے وہ لمحے بھی دیئے تھے جنہوں نے میری ساری کائنات کو رنگین بنا دیا تھا۔ یہ لمحے لوٹ کر نہیں آسکتے لیکن ان لمحوں کا عکس تو انہیں تاروں میں محفوظ تھا۔ تار ٹوٹ گئے، زندگی کا آخری سہارا بھی ختم ہو گیا۔ میری طرف اس طرح گھور گھور کر نہ دیکھو۔ میں پاگل نہیں ہوں۔
محمود: تم نہیں جانتے۔ میرے دوستوں میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ میں ایک لڑکی سے بے پناہ محبت کر چکا ہوں اور یہ محبت ابھی تک اسی طوفانی کیفیت کے ساتھ میرے دل کی گہرائیوں میں موجزن ہے۔ اس لڑکی کا نام ریحانہ ہے۔ ریحانہ جس نے مجھے اپنے فن سے محبت کرنا سکھائی تھی جو ستارۂ صبح کی سی لطافتیں لیکر میری زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ چاندنی رات کا ایک مرمریں نغمہ تھی۔ کہکشاں کے آبشار کی ایک سرمست لہر تھی۔ اس کے کالے لمبے بالوں کے ریشمیں انبار میں بہار کے اوّلیں سانسوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں پر گھنیری پلکیں اس طرح پھیلی ہوئی تھیں جیسے دور کسی وادی میں ایک پُرسکون جھیل اونچے اونچے درختوں کے پُراسرار سایوں سے ڈھکی ہوئی ہو۔ اس کے شفاف گالوں کی سرخی دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا گویا سفید گلاب کے ہجوم میں گلِ لالہ کی

شمعیں روشن ہوں۔ وہ جس وقت چلتی تھی تو دھرتی کے سوئے ہوئے راگ بے اختیار جاگ اٹھتے تھے۔ وہ جب باتیں کرتی تھی تو ارد گرد کی فضا کیف و مستی میں ڈوب جاتی تھی۔ میں نے اسے کائنات کی سب سے حسین چیز سمجھ کر پیار کیا تھا۔ اور اس نے بھی مجھے کائنات کی سب سے قیمتی شے دے دی تھی۔ میرے اندر زندہ رہنے کا حوصلہ، زندگی سے پیار کرنے کا ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ تم میری طرف اس طرح دیکھ رہے ہو۔ جیسے میری باتوں پر تمہیں اعتبار نہیں مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ یہ میرا کوئی خواب نہیں ہے۔ یہ میری زندگی کی سب سے خوب صورت حقیقت ہے۔ سب سے خوبصورت اور رنگین حقیقت۔

محمود: (حیرت سے شہاب کو دیکھتے ہوئے) اس کے بعد۔

شہاب: میں نے سب سے پہلے اسے اس وقت دیکھا جب زندگی سے بالکل مایوس ہو کر خودکشی کا ارادہ کر چکا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اپنی جیون ساتھی ستار کو چھاتی سے چمٹائے چپ چاپ پانی کی اندھیری گہرائیوں میں اتر جاؤں گا۔ اسی مقصد کے لئے دریا کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ اس وقت میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی۔ میری انگلیاں آخری بار ستار کے تاروں کو چھونے لگیں۔ وہ موت کا نغمہ تھا۔ میری زندگی کا آخری نغمہ تھا۔ نغمہ ختم ہونے ہی والا تھا کہ اچانک میری نظر دائیں طرف پڑی۔ وہاں چند لڑکیاں خاموش بیٹھی ستار سن رہی تھیں۔ یہ لڑکیاں پکنک کے لئے وہاں آئی ہوئی تھیں۔ ان میں ریحانہ بھی تھی۔ اس کے ہونٹوں اور آنکھوں میں بڑی پیاری مسکراہٹ تھی اس نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "آپ تو کمال کرتے ہیں۔ کچھ دیر اور" ان لفظوں میں زندگی کا رس تھا، زندگی کا شہد تھا۔ مجھے موت کی ڈراؤنی تاریکیوں میں زندگی کے چراغ کی ایک لو سی تھرتھراتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

(وقفہ ——)

محمود: اس کے بعد؟

شہاب : اس کے بعد میں نے اسے ایک مجلسِ موسیقی میں دیکھا۔ وہ پہلی قطار میں بیٹھی تھی۔ میرا نام پکارا گیا۔ اور میں سٹیج پر جا کر ستار بجانے لگا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ میرا پروگرام اس دن سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ ریحانہ میرے سامنے بیٹھی تھی اور اس کی مسکراہٹ میرے دل کو اس طرح چھو رہی تھی جیسے بہار کے دنوں میں رنگ و بو کا قافلہ خراماں خراماں کسی خاموش وادی میں سے گزرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد کنسرٹ ختم ہو گئی تو وہ مجھ سے ملی۔ اس نے مجھ سے ستار سیکھنے کی استدعا کی۔ مجھے معلوم نہیں اس وقت میں نے کیا جواب دیا تھا۔ مگر اس کے بعد میری زندگی گل پوش فضاؤں میں پرواز کرنے لگی تھی۔

(وقفہ ــــــــــــ)

محمود : (لہجے میں بدستور حیرت) اور ـ

شہاب : ہم دونوں گھنٹوں ایک دوسرے کے پاس بیٹھے رہتے۔ کبھی باغ کے کسی کنج میں۔ کبھی کسی تاریخی عمارت میں اور کبھی دریا کے کنارے پیپل کے اس درخت کے سائے تلے۔ جہاں میں نے پہلی بار ریحانہ کو دیکھا تھا۔ دن گزرتے گئے۔ راتیں گزرتی گئیں اور ہم دونوں ایک دوسرے میں اسی طرح کھو گئے جس طرح ستار کے تاروں کی تمام لرزشیں ایک نغمہ بن کر فضا میں پھیل جاتی ہیں۔ وہ سماں کتنا پیارا ہوتا جب میں چاندرات کو درخت کے نیچے بیٹھ کر ستار بجاتا، اور وہ مجھے دیکھتے دیکھتے مدہوش ہو جاتی۔ محبت کا یہ نشہ کتنا عجیب، کتنا مقدس تھا۔ (لہجے میں دکھ)

محمود : شہاب !

شہاب : ہماری ملاقاتوں کی خبر لوگوں کو ہو گئی۔ ریحانہ کا باپ غصے سے دیوانہ ہو گیا، وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی اکلوتی لڑکی ایک معمولی ستار نواز کو اپنا سب کچھ سمجھ لے۔ اس نے ریحانہ کو بہت بری طرح ڈانٹا۔ وہ رو رو کر مجھ سے کہنے لگی "شہاب حالات کا دھارا جس طرف جا رہا ہے تم اس سے بے خبر نہیں ہو۔ میرے والد اور میرے

سارے گھر والے سخت ناراض ہیں۔ آج سے ہم ایک دوسرے سے نہیں مل سکیں گے۔"
یہ الفاظ سن کر ساری دنیا میری آنکھوں تلے گہرے اندھیرے میں ڈوبنے لگی، اس نے
میری حالت کا اندازہ لگا لیا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگی۔ "تمہیں مایوس
نہیں ہونا چاہیئے شہاب! کیا ہماری محبت کے نغمے ان تاروں کے سینے میں ہمیشہ کے
لئے محفوظ نہیں ہو گئے اور کیا ہمارے پیار کا راگ ان کے ہونٹوں پر سویا ہوا نہیں ہے
تم جب بھی اپنی تنہائیوں میں انگلیوں سے ان تاروں کو چھیڑو گے۔ یہ محبت کے نغمے بیدار
ہو جائیں گے۔ پیار کا یہ راگ جاگ اٹھے گا۔ چاندنی راتیں واپس آ جائیں گی۔ دریا کے
کنارے کا یہ سماں جی اٹھے گا۔ یہ ہوائیں مہک اٹھیں گی، اور تم مجھے اپنے قریب
دیکھو گے۔ اس قدر اپنے قریب جس قدر یہ ستار تمہارے قریب ہو گی۔ اور پھر میں زیادہ
مدت تم سے جدا بھی نہیں رہوں گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ایک نہ ایک دن ضرور تم
سے ملوں گی۔ ضرور ملوں گی۔ اور اس کی آنکھوں کی نیلاہٹوں میں ستارے جھلملانے
لگے اور ادھر میرے سینے میں آنسوؤں کا سیلاب موج زن ہو گیا اور پھر ہم جدا ہو
گئے۔ وہ میرے سامنے چلی گئی۔ یہاں تک کہ پل کے اس طرف اندھیرے میں غائب
ہو گئی۔

(باہر باد و باراں کا طوفان۔ دروازے کے دونوں پٹ بار بار
ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔)

محمود: طوفان آ گیا۔

شہاب: وہ چلی گئی۔ میں بھی لوٹ آیا۔ اس نے سچ کہا تھا۔ ہماری محبت کے نغمے ستار
کے تاروں میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ میں نے اکثر اپنے آپ کو ان کی جھنکار میں گم کر دیا
ہے۔ مجھ پر اس کی جدائی کبھی شاق نہیں گزری۔ مگر اب (آواز میں گہرا درد) تار ٹوٹ
گئے ہیں۔ محبت کی امانت لٹ چکی ہے۔ چاندنی راتوں کے ہار کا ایک ایک دانہ بکھر
گیا ہے۔ قوس قزح کا شاندار محل سرنگوں ہو گیا ہے۔ پیپل کے درخت کی شاخیں جل کر

خاکستر ہوگئی ہیں۔ دریا کا کنارا دور تک پانی کے اندر چلا گیا ہے۔ اب میں کیا کرسکتا ہوں۔

محمود: ستار ابھی زندہ ہے شہاب۔

شہاب: مگر وہ تار۔ محبت کے وہ سنہرے سپنے۔ وہ شکستہ ہوگئے ہیں، ان کے سینے پھٹ گئے ہیں۔ ان کی روح پامال ہوچکی ہے۔

(باہر طوفان میں شدت)

میں وہ چاندنی راتیں اب کیسے واپس لاسکوں گا۔ وہ معطر گیسو کس طرح میرے شانوں پر لہرائیں گے۔

محمود: دیکھو شہاب، میرے دوست!

شہاب: مجھے جانا چاہیئے۔ اس کی تلاش میں۔ میں اس سے کہوں گا ریحانہ! یہ دیکھو —— یہ تار ہماری امانت کی حفاظت نہیں کرسکے۔ انہوں نے ہمارا خزانہ آگل کر مٹی میں ملادیا ہے، میں مجبور ہوکر آگیا ہوں۔ بگڑو نہیں میرے لئے زندہ رہنے کا کوئی سہارا نہیں رہا تھا میں آگیا ہوں۔

(شہاب ستار اٹھاکر کھڑا ہوجاتا ہے اس کا رُخ جنوبی دروازے کی طرف ہے)

محمود: (اس کے آگے کھڑے ہوکر) ٹھہرو شہاب۔

شہاب: مجھے روکو نہیں محمود! ہٹ جاؤ، میں ضرور جاؤں گا۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔

محمود: تم نہیں جاسکتے۔ اس حالت میں تمہیں باہر جانے کی اجازت دینا تمہارے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔ خدا کے لئے رُک جاؤ۔

شہاب: میں ضرور جاؤں گا —— ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ۔

(شہاب اس کے روکنے کے باوجود ہیجانی کیفیت سے آگے بڑھتا جاتا ہے اور دروازے سے نکل جاتا ہے۔ محمود اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔ اس کی آواز، شہاب شہاب" کہتے کہتے

طوفان میں ڈوب جاتی ہے اب اسٹیج پر کوئی نہیں ہے، وقفہ
——— محمود آتا ہے۔ کپڑے بھیگے ہوئے، مایوس اور فکرمند بظر
جھکا ہوا۔ وہ ابھی دالان میں دری کے قریب کھڑا ہے سہیل
آتا ہے۔ ایک ہاتھ میں چھاتا دوسرے میں ایک بڑا سا لفافہ ہے)

سہیل: (لفافہ دری پر رکھ دیتا ہے۔ رنگترے باہر نکل آتے ہیں) توبہ کتنا طوفان ہے!

محمود: طوفان تو گزر چکا ہے۔

سہیل: کہاں گزر چکا ہے۔ باہر جاکر تو دیکھو (محمود کے گیلے کپڑے دیکھ کر) تمہارے کپڑے گیلے! (محمود خاموش رہتا ہے)

یہ ماجرا کیا ہے۔ شہاب سو رہا ہے؟

محمود: یہی تو میں کہہ رہا ہوں، طوفان گزر چکا ہے۔

سہیل: کیا مطلب؟

محمود: تمہارے آنے سے پہلے طوفان آیا اور شہاب کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔

سہیل: کیا کمار کوٹھڑی میں تیزی سے جاتے ہوئے) شہاب کہاں ہے؟ محمود!

(سہیل جلدی سے باہر آتا ہے)

محمود: چلا گیا ہے۔

سہیل: کہاں؟

محمود: اپنی محبوبہ کو ڈھونڈنے چلا گیا ہے۔ (وقفہ)

سہیل: محبوبہ کو ڈھونڈنے۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

محمود: آج ہیجانی کیفیت نے اسے پاگل کر دیا اور وہ ریحانہ کو ڈھونڈنے چلا گیا۔

سہیل: یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ریحانہ؟۔ کون ریحانہ؟ میں پندرہ سال سے سائے کی طرح شہاب کے ساتھ ساتھ رہا ہوں۔ آج تک کوئی عورت بھی اس کی زندگی میں داخل نہیں ہوئی۔ وہ ساری عمر محبت کے معاملے میں سخت بدنصیب رہا۔

محمود: لیکن آج تو مجھے اس نے اپنی ساری داستانِ محبت سنا دی تھی۔

سہیل: کون سی داستانِ محبت؟

محمود: آج نہ جانے کیوں اس پر ایک ہیجانی کیفیت چھا گئی تھی۔ تیزی سے ستار بجاتے بجاتے اس کے چند تار ٹوٹ گئے۔ اس واقعے نے اس پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اور وہ جذباتی شدت سے پاگل سا ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ان تاروں میں اس کی اور ریحانہ کی محبت کے نغمے محفوظ تھے، اور ان کے ٹوٹ جانے سے وہ نغمے بکھر کر ختم ہو گئے ہیں۔ اس نے کہا ریحانہ کو اس نے اس وقت دیکھا جب وہ ایک دن زندگی سے سخت مایوس ہو کر اپنے آپ کو دریا کی لہروں میں بہانے کے لئے ساحل پر پہنچ گیا تھا۔ اور آخری بار پیپل کے ایک درخت کے نیچے ستار بجا رہا تھا۔ وہاں چند لڑکیاں بھی موجود تھیں جن میں ریحانہ بھی تھی۔

(سہیل حیران ہو کر محمود کو دیکھ رہا ہے)

تم اتنے حیران کیوں ہو گئے ہو۔ شہاب نے یہ واقعات تمہیں کبھی نہیں سنائے۔

سہیل: نہیں وہ سنا بھی نہیں سکتا تھا۔ کیوں کہ ان واقعات کا اس کی زندگی سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

محمود: تو پھر یہ واقعات؟

سہیل: یہ میری اسی نظم کے واقعات ہیں جو میں ایک ایڈیٹر کے ہاتھ بیچ کر آ رہا ہوں۔

محمود: یہ اسی نظم کی کہانی ہے؟

سہیل: ہاں — اسی نظم کی کہانی جو ابھی مکمل نہیں ہو سکی۔ میں نے اسے وہیں تک لکھا ہے جہاں ریحانہ اپنے محبوب سے کہتی ہے کہ اب وہ مل نہیں سکیں گے۔ — مگر اسے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ محبت کے نغمے ستار کے تاروں میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے ہیں۔ وہ جب بھی اپنی تنہائیوں میں ستار بجائے گا۔ محبت کے نغمے بیدار ہو جائیں گے۔

محمود: سہیل!

سہیل: واقعہ بالکل یہی ہے۔

محمود: تو اس نے نظم کے تخیئلی واقعے کو اپنی زندگی بنا لیا۔

سہیل: نظم اس کے سامنے لکھی گئی تھی۔ اس نے اس کے ایک ایک مصرعے کو کئی بار پڑھا تھا اور بہت متاثر بھی ہوا تھا اور پھر یہ کہانی بھی ایک ستار نواز ہی کی تھی۔

محمود: تو آؤ اسے ڈھونڈھ کر واپس لے آئیں۔ وہ ابھی دور نہیں گیا ہوگا۔

سہیل: مجھے یقین ہو گیا ہے وہ واپس نہیں آئے گا۔ جس شخص نے ایک تخیئلی کہانی سن کر اسے اپنی زندگی بنا لیا اس کے دل و دماغ کی کیفیت تم نہیں سمجھ سکتے۔ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا (لہجے میں گہرے دکھ کی لرزش) اور ایک دن کسی باغ میں، کسی تاریخی عمارت میں یا دریا کنارے پیپل کے درخت کے نیچے اپنی خیالی محبوبہ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہت دور چلا جائے گا۔ بہت دور جہاں سے پھر کبھی واپس نہیں آئے گا، مگر اس گھر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے گا۔ اپنے اس پیارے دوست کے لئے جو کبھی ادھر کا رُخ نہیں کرے گا۔

(سہیل مایوسی سے اپنا سر جھکا لیتا ہے محمود اسے استفسار طلب نظروں سے دیکھتا ہے۔ مگر زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالتا۔)

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

بہن

افرادِ تمثیل

نزہت .... جمیلہ کی سہیلی

جمیلہ .... ایک نرس

ساجدہ .... نرس

ایلس .... نرس

شمیم .... نرس

پروین .... نرس

گونگی .... ملازمہ

منظر

(نرسز ہوم)

جمیلہ کا کمرہ، صاف ستھرا اور سادہ جیسا کہ ایک نرس کا ہونا چاہیئے۔ آنے جانے کے لئے صرف ایک دروازہ جنوبی دیوار میں ہے۔ اور جس پر نیلے رنگ کا پردہ لٹک رہا ہے۔ دو کھڑکیاں سامنے کی دیوار میں۔ دونوں پٹ کھلے ہوئے۔ کھڑکیوں میں سے دور اُفق کے نیچے درختوں کی ایک مسلسل قطار چلی گئی ہے۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے جمیلہ سامنے کی دیوار سے سہارا لگائے پلنگ پر بیٹھی ہوئی نظر آتی ہے۔ عمر تیس سال کے لگ بھگ، چہرے پر جا بجا چیچک کے نشان، رنگ سیاہی مائل، پلنگ کے پاس تپائی کے اوپر چائے کی ٹرے پڑی ہے۔ اس کے علاوہ دو کرسیاں بھی ہیں جو پلنگ کے قریب اس طرح رکھی گئی ہیں کہ ان پر بیٹھنے والوں کے چہرے ایک دوسرے کے سامنے رہتے ہیں۔

وقت: دن کا تیسرا پہر۔

جمیلہ دروازے کی طرف اس طرح دیکھ رہی ہے جیسے کسی کی منتظر ہو کمرے کے باہر نرسوں کی آوازیں، سیٹیاں اور قہقہے گونج رہے ہیں۔

نزہت آتی ہے۔ اونچے متوسط طبقے کی لڑکی۔ لباس بھڑکیلا، جمیلہ کی ہم عمر، ہاتھ میں پرس، چہرہ پوڈر اور لپ سٹک سے آراستہ۔

نزہت : (کمرے میں داخل ہوتے ہی) چہ خوب۔ حضور ابھی تک بستر پر دراز ہیں۔ کیوں خیر تو ہے۔ پلنگ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتیں

جمیلہ : خراب ہے طبیعت، دو ایک روز میں ٹھیک ہو جائے گی۔

نزہت : ہوسپٹیل سے ہو کر آ رہی ہوں۔ میں نے سمجھا ڈیوٹی پر چلی گئی ہو۔

جمیلہ : چلی جاؤں گی، ڈیوٹی پر بھی۔ بیٹھو۔ اتنے دنوں کے بعد آئی ہو

نزہت : (کرسی پر بیٹھتے ہوئے بیزاری سے) کیا کروں ناک میں دم آگیا ہے۔ کراچی سے بہن آگئی ہے۔ خیر اسے تو آنا ہی تھا —— مگر ساتھ بچوں کی فوج بھی آگئی ہے۔ شیطانوں نے وہ اودھم مچا رکھا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ سارا سارا دن میرے کمرے میں گھسے رہتے ہیں۔ شاید ہی کوئی چیز سلامت رہے گی

جمیلہ : (لہجے میں اشتیاق) بہن آئی ہے۔ بڑی چہل پہل ہو گی۔

نزہت : چہل پہل کیا ہو گی۔ میں تو پریشان ہو گئی ہوں جمیلہ! جانے یہ طوفان کب جائے گا۔

جمیلہ : طوفان کیسا! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ اپنی سگی بہن۔ اور وہ بھی ایک مدت کے بعد ملے۔ تم تو یونہی چڑچڑا کرتی ہو۔ خوب باتیں ہو رہی ہیں بہنوں میں آج کل ــــ ہیں نا؟

نزہت : باتیں کیا خاک ہوں گی۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں اس دنیا میں کیا کچھ ہوتا رہتا ہے۔ لوگ کسی کی نیکی کو نیکی سمجھتے ہی نہیں۔

جمیلہ : (آہ بھر کر) مجھ سے زیادہ کون سمجھے گا اس بات کو؟ ثریا کو جانتی ہو نا۔ ہوا یہ کہ...

نزہت : (بے تابی سے جمیلہ کے الفاظ کاٹ کر) میرے بس میں ہو تو کہیں دور بھاگ جاؤں جہاں یہ رشتہ داریاں اور ان کا جھنجھٹ نہ ہو۔ تم جانتی ہو نا رفیعہ کی نند کے چھوٹے بھائی کا رشتہ آیا تھا۔ اپنی اصغری کے لئے مجھے تو یہ رشتہ ہرگز پسند نہیں مگر رفیعہ سمجھتی

ہے اس سے بہتر رشتہ کہیں مل ہی نہیں سکے گا۔ بس یہ جھگڑا ہے۔ اور اسی لئے وہ کراچی سے آئی ہے۔ ہمیں سمجھانے کے لئے ہونہہ۔ ہمیں سمجھائے گی!

(ساجدہ آتی ہے۔ نرس کی یونیفارم میں ملبوس)

ساجدہ: کہو جمیلہ! کیا حال چال ہے۔ بھئی اُٹھ بیٹھو نا۔

نزہت: یہ یوں نہیں اٹھے گی زبردستی اٹھانا پڑے گا اسے۔

ساجدہ: سچی بات یہ ہے اس نے یہ بیماری خود مول لی ہے۔ یہ حال نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا۔ نرس کو PATIENT کی خدمت کرنی چاہیئے پر خود کو قربان تو نہیں کر دینا چاہیئے۔

جمیلہ: ثریا کے بارے میں کہہ رہی ہو؟ معلوم ہے اس نے کیا کہا تھا؟

ساجدہ: ہزار بار سن چکی ہوں۔ بس چپ رہو۔ بالکل SILLY ہو۔

نزہت: ہوا کیا ہے؟

ساجدہ: (بظاہر ہمدردی سے) دیکھو نزہت! یہ بھی کوئی بات ہے کہ ایک PATIENT تمہیں بہن کہہ دے اور تم اس کے لئے تین بار اپنا BLOOD دے دو۔ شکر کرو ایم۔ ایس کو یہ بات معلوم نہیں ہوئی ورنہ۔ تم جانتی ہو نا کتنی سخت طبیعت ہے اس کی!

نزہت: تین بار BLOOD دیا؟ اندھیر ہے (طنزاً) اپنی صحت جو ماشاء اللہ نہایت اچھی ہے۔

ساجدہ: صرف یہی نہیں بلکہ آف ڈے کو بھی اس کی خدمت کرتی رہی۔

جمیلہ: (آواز میں درد) اور ساجدہ! ثریا نے گھر پہنچ کر جو کچھ کیا ہے وہ ——————

ساجدہ: بالکل SILLY ہو۔ (رسٹ واچ دیکھ کر) اچھا — چیرلو۔

(ساجدہ چلی جاتی ہے)

جمیلہ: (اپنے خیال میں) میں نے اسے اپنی بہن سمجھا تھا۔ اس نے مجھے بہن کہہ کر بلایا جو تھا، مگر —

نزہت: پھر بہن۔ اُونہہ — کبھی دیکھا بھی ہے بہنوں کو۔ رفیعہ بہن ہی تو ہے مگر کیا

مجال جو اسے اپنے گھر والوں سے ذرہ برابر بھی دلچسپی ہو۔ مانا اس کی نند کا بھائی ولایت سے انجنیئرنگ کی ڈگری لے کر آیا ہے لیکن ان لوگوں کے پاس نہ تو اپنا بنگلہ ہے اور نہ کار ہے۔ اصغری اس گھر میں کیوں کر جا سکتی ہے؟ خود غور کرو کتنی بڑی مصیبت ہے میرے لئے۔ بہر حال میں اصغری کو تو وہاں ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ بنگلے اور کار کے بغیر بھی کوئی زندگی ہے۔

(وقفہ)

جمیلہ: اور اس مصیبت کا بھی اندازہ کرو نا۔ میں نے۔

نزہت: (جلدی سے) ایک مصیبت ہو تو کوئی کہے بھی، اب سنو، ایک اور مصیبت نازل ہو گئی ہے۔ خالو جان بیٹھے بٹھائے بیمار ہو گئے ہیں اور مصیبت یہ ہے کہ بجائے کوٹھی ہی میں رہتے ہیں۔ زرینہ کے ساتھ مری جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اللہ جانے یہ پروگرام کبھی پورا ہو گا بھی یا نہیں (آہ بھر کر) کتنی خوش قسمت ہو تم سب سے الگ تھلگ بیٹھی ہو۔

جمیلہ: نزہت! (آہ بھر کر) تمہیں کیا خبر ــــ

نزہت: مجھے سب کچھ خبر ہے زندگی سے سکون اور اطمینان رخصت ہوتا جا رہا ہے۔ بہن بہن کی نہیں سنتی ــ بس صبح شام یہی رٹ لگا رکھی ہے کہ لڑکا نہایت شریف اور محنتی ہے۔ کوئی پوچھے اس سے جا کر ہم کسی کی شرافت کو چاٹیں شہد لگا کر ــــ یہ عائشہ کا بھائی کتنا اچھا ہے۔ جانتی ہو نا۔ پر تم نے کہاں دیکھا ہو گا۔ باپ گورنمنٹ کنڈیکٹر ہے۔ پرسوں کہنے لگے عائشہ کو ولایت بھیجنے کا ارادہ ہے۔ کہو تو تمہارے لئے بھی انتظام کر دیں۔ (آہ بھر کر) ہائے ولائیت، مہذب سوسائٹی۔ نئی دنیا۔ میں تو ضرور جاؤں گی۔ یہاں کی زندگی سے میری طبیعت سخت بیزار ہو گئی ہے۔

(گونگی آتی ہے)

گونگی: (جمیلہ سے ٹرے کی طرف اشارہ کر کے) آں۔ آں۔ آں۔

جمیلہ: (ہاتھ کے اشارے سے) لے جاؤ۔ میں نہیں پیوں گی۔

گونگی: (نفی میں سر ہلاتے ہوئے: جیسے کہہ رہی ہو پیو گی نہیں) آں۔ آں۔

جمیلہ: نہیں بابا (ہاتھ کے اشارے سے) جاؤ — نہیں چاہیئے چائے —

(گونگی ٹرے اٹھا کر چلی جاتی ہے)

نزہت: یہ جانور کہاں سے پکڑ لائی ہو تم

جمیلہ: یہ گونگی — بیچاری محتاج ہے۔ چند روز سے ملازم ہوئی ہے —
تو میں کہہ رہی تھی اس ثریا۔

نزہت: ارے یاد آ گیا۔ جمیلہ! تمہیں یاد ہو گا پچھلے مہینے سوٹ کا کپڑا کس دکان سے خریدا تھا۔ ساری انارکلی گھوم چکی ہوں، مگر وہ کپڑا نہیں ملا۔ عذرا وغیرہ نے بہت پسند کیا ہے۔ سوچتی ہوں ایک سوٹ کا اور لے لوں تمہیں یاد ہو گی دکان —

ضرور یاد ہو گی!

جمیلہ: (لہجے میں کسی قدر بیزاری) نہیں! مجھے کیا معلوم!

نزہت: ہائے میرے اللہ! تمہیں بھی یاد نہیں رہی — اب کیا ہو گا عجیب مصیبت ہے۔

(کمرے کے باہر سے "را را را — را را را کی آواز آتی ہے
ایلیس پردہ ہٹا کر جھانکتی ہے۔)

ایلیس: HELLO DARLING, HOW DO YOU DO?

جمیلہ: خراب ہے حالت!

ایلیس: کھراب ہے۔

جمیلہ: COME IN

ایلیس: پھرست نہیں۔

جمیلہ: اچھا

ایلیس : .O.K ــــ رارارا ــــ رارارا ــــ رارا

(ایلیس چلی جاتی ہے۔ شمیم دروازے پر آتی ہے)

شمیم : اے جمیلہ ! میں نے کہا چلوگی باہر ذرا !

جمیلہ : نہیں۔ طبیعت اچھی نہیں !

شمیم : طبیعت اچھی نہیں (WHAT A WONDERFULL) تو نہیں چلوگی ــــ

ــــ ہاں کیا حال ہے تمہاری منہ بولی بہن ثریا کا۔

جمیلہ : بتاتی ہوں۔ اس نے جو کچھ کیا ہے۔ اندر آؤ۔ ایک منٹ کے لئے

ــــ دروازے پر کیوں کھڑی ہو ؟

شمیم : ضرور بیٹھتی اندر آکر مگر کیا کروں۔ زبیدہ کم بخت نے پکچر کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ میں تو کہتی ہوں تم بھی چلو۔ خوب ENJOY کریں گے۔

جمیلہ : آج تمہاری ڈیوٹی تو نہیں ــ آؤگی ۔ باتیں کرنا ہیں۔

شمیم : کم بخت زبیدہ نے اپنے فرینڈ کو بھی بلا رکھا ہے ــــ پکچر کے بعد ہوٹل میں جانا ہوگا ــ آؤں گی ــ فرصت کے وقت ! اچھا ــ چیریو۔

(شمیم چلی جاتی ہے۔ گونگی ایک مرتبہ پھر آتی ہے)

گونگی : (جمیلہ کو ایک رقعہ دیتے ہوئے اوپر کی طرف اشارہ کر کے) آں ۔ آں ۔ ں !

جمیلہ : بدر نے دیا ہے (رقعہ کھول کر پڑھتی ہے) اچھا۔

نزہت : کیا ہے ؟

جمیلہ : میں نے بدر سے کہا تھا۔ ذرا نیچے آکر میرے پاس بیٹھو۔

نزہت : تو ــ !

جمیلہ : شاپنگ کے لئے جا رہی ہے۔

نزہت : میں کہتی ہوں جمیلہ ! یہ نرسیں بڑی خود غرض ہوتی ہیں۔ اچھا بھئی ــــ میری اچھی بہن ! ذرا حافظے پر زور دو نا ــ کہاں ہے وہ دکان ۔

جمیلہ: میں کیا کروں؟ خواہ مخواہ پریشان کر رہی ہو۔

نزہت: ہائے تم نہیں جانتیں، مجھے کتنی پریشانی ہوگی۔ عذرا بھی ڈھونڈنے نکلی ہوگی۔ تمہیں یاد ہے نا دکاندار کے پاس صرف دو سو نوٹوں کا کپڑا تھا۔ کتنی غلطی کی۔ اسی وقت سارا کپڑا خرید لیتی۔ یہ بات تمہیں بھی نہ سوجھی۔ میرا خیال ہے۔ نیلے گنبد کے اس طرف ——

جمیلہ: میں کہتی ہوں کچھ بھی یاد نہیں۔

نزہت: کتنا کمزور ہے تمہارا حافظہ۔

(ساتھ کے کمرے میں ریکارڈ بجتا ہے)

اور سنو! مصیبت اکیلی نہیں آتی۔ رفیعہ کے سب سے چھوٹے شیطان نے میرا ریڈیو سٹ خراب کر دیا ہے۔ آج رات کراچی سے ایک بڑا شاندار مشاعرہ ریلے ہوگا کیسے سن سکوں گی۔ کیا مصیبت ہے۔ یہ رفیعہ کی بچی نہ آتی تو کیا اچھا ہوتا۔

(ریکارڈ کے ساتھ قہقہوں کی آواز بھی بلند ہوتی ہے)

جمیلہ: توبہ! (بیزاری اور مایوسی کے عالم میں اپنا سر دیوار سے لگا دیتی ہے)

نزہت: کیا ہوا؟

جمیلہ: کچھ نہیں۔

(پروین پردہ ہٹا کر آتی ہے)

پروین: جمیلہ! طبیعت کیسی ہے۔ سنا ہے ابھی تک نصیبِ دشمناں۔ ہے کچھ ایسی بات۔ میرا مطلب ریکارڈ

جمیلہ: (بیزاری سے) نہیں کوئی حرج نہیں۔ یہاں تک تو آواز آتی بھی نہیں —————— (دیوار سے سر ہٹا لیتی ہے)

پروین: آواز تو آتی ہے۔ میں تو لگانے کے لئے تیار نہیں تھی۔ پر ایک فرینڈ آ گئی ہے۔

جمیلہ: کوئی بات نہیں۔

نزہت : یہ ریکارڈ ہیں۔

پروین : شوق ہے تو آیئے۔

نزہت : اچھا دو ایک منٹ بیٹھ جاتی ہوں۔ پھر کپڑے کی دکان ڈھونڈنی ہوگی —
اچھا جمیلہ -!

جمیلہ : اچھا۔

(نزہت اپنا پرس اٹھا کر کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔ اب کمرے میں جمیلہ کے سوا اور کوئی نہیں۔ ساتھ کے کمرے سے ریکارڈ کی آواز آرہی ہے۔ باہر سے سیٹیوں اور قہقہوں کی جھنکار بھی وقفوں کے بعد آجاتی ہے۔

جمیلہ پیشانی پر ہاتھ پھیرتی ہے اور مایوسی کی شدت میں آنکھیں بند کر لیتی ہے گونگی آتی ہے۔ جمیلہ کو اس حالت میں دیکھ کر ٹھٹھک جاتی ہے۔ مڑنے لگتی ہے، مگر پھر رک جاتی ہے۔ اب شام ہو چکی ہے۔ کمرے کا وہ حصہ نسبتاً روشن ہے۔ جہاں پلنگ بچھا ہے۔ کیونکہ کھڑکیوں کے باہر میونسپلٹی کا بلب روشن ہے۔

گونگی آہستہ آہستہ جمیلہ کی طرف آرہی ہے۔ دروازے کے باہر نرس گاتے ہوئے گزرتی ہے ؎

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں —— مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
آخری لفظ بلند بانگ "رارارا۔ رارارا" میں ڈوب جاتا ہے۔ ساتھ کے کمرے سے قہقہوں کی جھنکار آتی ہے۔ جمیلہ پریشان ہو کر اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیتی ہے۔ گونگی دروازہ بند کر دیتی ہے۔ اور جمیلہ کی طرف بڑھتی ہے۔ آواز مدھم ہو جاتی ہے۔ جمیلہ آنکھیں کھول دیتی ہے۔ گونگی کی طرف دیکھتی ہے۔ گونگی آنکھیں جھکائے خاموش کھڑی رہتی ہے۔)

جمیلہ : کیا بات ہے؟ (گونگی نگاہیں جھکائے خاموش کھڑی رہتی ہے) دروازہ تمہیں نے بند کیا ہے —— ؟ بہت اچھا کیا ہے (لہجے میں مایوسی) یہاں کون آئے گا۔

اب کس کو یہاں آنے کی فرصت ہے کوئی نہیں، کوئی نہیں۔ اس وسیع کائنات میں ہر شخص مصروف ہے، کسی کو بھی دوسرے کا دکھ درد سُننے کی فرصت نہیں! کوئی محرم۔ (آہ بھر کر خاموش ہو جاتی ہے)

(وقفہ)

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں!

جمیلہ شدتِ تاثر سے اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ گونگی ہاتھ بڑھا کر اس کا سر دبانے لگتی ہے)

نہیں۔ میرا سر نہ دباؤ۔ مگر تم۔

(جمیلہ آنکھیں کھول لیتی ہے اور اس کی طرف دیکھتی ہے)

— تم کیا کرنے آئی ہو میرے پاس۔ کیا تمہارا کوئی پروگرام نہیں ہے؟ تمہیں اتنی فرصت کیسے مل گئی ہے؟؟

(دونوں چند لمحے چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتی رہتی ہیں۔ گونگی کی نگاہوں میں ہمدردی ہے اور جمیلہ کی آنکھوں میں ایک بجھی بجھی سی کیفیت)

میں نے چاہا تھا۔ کتنا چاہا تھا کہ کوئی آئے میرے پاس آکر بیٹھے۔ میرے دل میں جھانکے۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بہن کی سی ہمدردانہ نظروں سے مجھے دیکھے — مگر ——

(شدتِ احساس سے دوبارہ آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ گونگی اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیتی ہے جمیلہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ اب آخر تک جمیلہ جو کچھ کہے گی کبھی آہستہ آہستہ کہے گی۔ اور کبھی تیزی سے، باہر سے موسیقی کی مدھم آواز آتی رہے گی اور وقفوں کے بعد قہقہے بھی)

یہ دنیا کتنی عجیب ہے! ۔کتنی عجیب ہے؟

(گونگی اس کے اور قریب ہو جاتی ہے اور بڑی ہمدردی سے

اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگتی ہے)

کوئی بھی کسی کے دکھ درد کو نہیں سمجھتا۔ کوئی بھی دوسرے کی آنکھوں میں نہیں جھانکتا۔ اس وسیع آبادی میں کتنی اجنبیت ہے۔ کتنی بیدردی، کتنی بے رُخی ہے۔ اگر آج کوئی میرے دل کو ٹٹولتا تو دیکھتا اس کی گہرائیوں میں کتنا بڑا طوفان برپا ہے۔ کتنی ہلچل مچی ہے۔ ! میں اسے بتاتی۔

(دو تین لمحے خاموشی)

میں اسے کیسی دردانگیز کہانی سناتی۔ !یہ کہانی کوئی بھی نہ سن سکا۔ کوئی بھی نہیں سن سکا۔ میرا دل اپنا افسانۂ غم کہنے کے لئے کتنا بے قرار تھا۔ کس قدر بے قرار۔ اگر کوئی میرے پاس آتا تو میں کہتی دیکھو بہن! آج انسانوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ان کے دل کس قدر کٹھور ہو گئے ہیں۔

میں نے۔ ثریا کو اپنی بہن سمجھا تھا! میں اس کے لئے اپنی جان بھی خوشی سے قربان کر دیتی۔ کیوں کہ ایک دن اس نے کہا تھا۔" بہن! میں تمام عمر تمہاری ممنون رہوں گی۔ تم جو کچھ کر رہی ہو وہ ایک سگی بہن بھی اپنی بہن کے لئے نہیں کر سکتی!"

(وقفہ)

میں جان گئی —— یہ ایک بہن کی آواز تھی۔ یہ آواز میری رگ رگ، نس نس میں گونج اٹھی۔ مگر (آواز میں درد جیسے آواز بھرا گئی ہے) جاتے ہوئے اسے اتنی فرصت بھی نہ ملی۔ کہ مجھ سے مل کر ہی جاتی۔ اور پھر۔ پھر (آواز تیز ہو جاتی ہے) اس نے یہ کتنا بڑا ظلم کیا کہ اپنے نوکر کے ہاتھ نوٹوں کا بنڈل بھیج دیا۔ (آواز میں درد کی شدت) ہائے یہ کتنی بے دردی ہے۔ کیسی دُکھ دینے والی بات ہے۔ ایک بہن کے پیار۔ ایک بہن کے آنسوؤں کی قیمت نوٹوں میں ادا کی جاتی ہے۔ ثریا کو کیا ہو گیا تھا۔ ثریا نے

کیا سمجھا تھا۔ ایک نرس ۔ صرف ایک نرس!

(جمیلہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ گونگی دوپٹے کے دامن سے اس کے آنسو پونچھتی ہے)

سگی بہن ۔ سگی بہن ہی ہوتی ہے۔ پر سگی بہن ۔ اوہ میرے اللہ۔ ایسا کیوں ہوتا رہا۔ ایسا کیوں ہوا۔ ہم دونوں بہنیں تھیں۔ دونوں نے ایک ہی ماں کے آغوش میں پرورش پائی تھی۔ ایک ہی باپ کے بازوؤں میں جھولا جھولا تھا۔ پھر کیا ہوا۔ شکیلہ خوب صورت تھی۔ اور میرے چہرے کو چیچک نے تباہ کر دیا تھا۔ میں بدصورت ہو گئی تھی۔ پر اس میں میرا کیا قصور تھا۔ اس معصوم زمانے میں، میں نے کون سا جرم کیا تھا۔ پھر اس کی سزا مجھے اتنی شدید کیوں ملی؟ آخر مجھے کس جرم کی پاداشں میں اتنا دکھ اٹھانا پڑا۔

ابا شکیلہ کو گود میں اٹھا کر بڑے فخر سے اپنے دوستوں کے پاس لے جاتے تھے۔ اور میں ۔ کمرے کے اندر ہی پڑی رہتی تھی۔ اماں مجھے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگتی تھیں۔ میں جانتی تھی یہ محبت نہیں رحم ہے۔ صرف رحم ہے۔ اور میرے سینے میں ایک کانٹا سا چبھنے لگتا تھا۔ اور پھر سکول میں ۔ وہاں بھی شکیلہ کو ڈراموں میں پارٹ دیا جاتا تھا اور مجھے بالکل نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔!

مجھ پر ہر بات کا ۔ ہر چیز کا اثر چپکے چپکے ہوتا رہتا تھا۔ شکیلہ معزور ہو گئی تھی۔ اور میں ۔ میرے دل میں حسد کا جذبہ چپ چاپ پرورش پا رہا تھا!

اور پھر وہ واقعہ ہوا۔ شکیلہ کے لئے ایک چھوڑ بیسیوں رشتے اور میرے لئے صرف ماں کی آہیں اور باپ کے اندیشے۔ ہم دونوں بہنیں ذرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے سے جھگڑ پڑتیں۔ اور کئی کئی دن تک گفتگو نہ کرتیں ۔ ہائے ہمیں کیا ہوتا جا رہا تھا ۔ ہمارے دلوں میں عداوت کا زہر کیوں بھر گیا تھا؟

(وقفہ)

میری بدصورتی نے مجھے قدم قدم پر شکست دی اور ہم دونوں بہنیں ایک دوسرے سے دور ہوتی چلی گئیں ۔ کبھی کبھی تنہائی میں میرا دل بے اختیار چاہتا تھا ۔ کاش! شکیلہ چپ چاپ یہاں آجائے اور میں سارا زہر، ساری عداوت آنسوؤں کے سیلاب میں بہا کر کہوں ۔ شکیلہ! ہم بہنیں ہیں ۔ ہماری رگوں میں ایک ہی خون گردش کر رہا ہے ۔ ہم کیوں بیکار کڑھتی رہتی ہیں ۔ ہم کیوں پاگل ہو گئی ہیں ۔ لیکن شکیلہ کے غرور نے اسے کبھی میرے پاس آنے کی اجازت ہی نہ دی ۔ وہ کبھی میرے دل کے دروازے پر دستک نہ دے سکی ۔ ! میں یہ سوچ کر رو پڑتی ۔ اور دیر تک روتی رہتی ۔ شادی کے بعد شکیلہ بہت دور چلی گئی اور میں ایک دائم المرض شخص سے بیاہ دی گئی ۔ وقت گزرتا گیا ۔ گزرتا چلا گیا ۔ میرا شوہر مر گیا ۔ اور میں ایک خاص آرزو لے کر ہسپتال میں نرس بن گئی پھر ایک سال اور گزر گیا اور ۔

(جمیلہ کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں ۔ اس کی آواز بھرا جاتی ہے گونگی دوپٹے سے اس کے آنسو پونچھتی ہے ۔ اس کی اپنی آنکھیں نم آلود ہو گئی ہیں)

پھر شکیلہ کا طویل خط آیا ۔ اس نے لکھا تھا ۔ میں مرنے والی ہوں ۔ آخری وقت میں میری حسرت ہے کہ تم کو گلے سے لگا کر اپنی بدسلوکیوں کی معافی مانگ لوں ۔ میں نے ہمیشہ تم سے بدسلوکی کی ہے ۔ مگر تنہائی میں مجھے ہمیشہ افسوس ہوتا رہا ہے ۔ اگر تم کسی دن تنہائی میں میرے پاس آجاتیں تو میں ضرور تم سے لپٹ جاتی ۔ پر تم مجھ سے دور دور رہیں ۔ ہائے میں سمجھتی رہی تم حاسد ہو اور چاہتی ہو کہ میں بھی تمہاری طرح بدصورت ہو جاؤں ۔

کاش اس وقت تم میرے پاس ہوتیں اور میں تم سے معافی مانگ کر دنیا سے رخصت ہوتی ۔ کاش

(وقفہ)

یہ شکیلہ کے الفاظ تھے اور ایک دم مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے میری رگ رگ میں ایک طوفان سا برپا ہو گیا ہے۔ جی چاہتا تھا کاش میرے پَر لگ جائیں اور میں اڑ کر بہن کے پاس پہنچ جاؤں مگر ـــــ

(وقفہ)

بہن انتظار نہ کر سکی ـــــ وہ چلی گئی، اور میرے دل میں طوفان برپا رہا۔

یونہی برپا رہا۔

(وقفہ)

میرے دل میں کتنی حسرت تھی کہ کوئی بہن بن کر میری زندگی میں داخل ہو۔ کوئی بہن کہہ کر مجھے پکارے ـــــ کوئی بہن سمجھ کر میرا دکھ درد سنے ـــــ کوئی ـــــ

(گونگی اپنا چہرہ اس کے اور قریب لے آتی ہے۔ دونوں آنسو بھری آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگتی ہیں۔ وقفہ۔ گونگی کا چہرہ بالکل قریب چلا آتا ہے۔ آنسوؤں سے اس کے رخسار گیلے ہو گئے ہیں۔ جمیلہ بیتاب ہو کر اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیتی ہے۔

بہن! ـــــ میری بہن!

گونگی: ب ـــ ب ـ

(ساتھ کے کمرے سے سازوں کا ریکارڈ بجتا ہے۔ دونوں کی سسکیوں کی آواز ساز میں ڈوب جاتی ہے)

سمندر کا دل

افرادِ تمثیل

حناں ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔

رکھی ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ حناں کی ہمسائی

صغریٰ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ایک بچی

شبیر ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ رکھی کا بیٹا

عباس ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ حناں کا شوہر

منظر

ایک پرانی طرز کا مختصر سا کمرہ

وسط میں لکڑی کے تین ستون جن کے درمیان ایک جیسا فاصلہ چھوڑا گیا ہے۔ لکڑی کے یہ ستون چھت کا بوجھ اٹھانے کے لئے قائم کئے گئے تھے یا صرف کمرے کو خوب صورت بنانے کی خاطر اس کے بارے میں کوئی بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مختلف وقتوں میں انہیں مختلف انداز سے استعمال کیا گیا ہے۔ آج کل ان میں سے دو کے درمیان ایک ننھا سا جھولنا لٹک رہا ہے۔ اور تیسرے ستون کے ساتھ ایک لالٹین کیل سے لٹکا دی گئی ہے۔ جھولنے کے سامنے دیوار کے ساتھ ایک پلنگ بچھا ہے جس پر ایک صاف ستھری چادر پڑی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس چادر کو آج ہی صندوق سے نکال کر بچھایا گیا ہے۔ دیواروں پر کچھ رنگین تصویریں بھی نظر آ رہی ہیں۔ ان میں وہ تصویر سب سے نمایاں ہے جو پلنگ والی دیوار پر آویزاں ہے اور جس میں ایک صحت مند جاپانی بچہ خود اپنے ہاتھ میں فیڈر اٹھائے دودھ پی رہا ہے۔

پلنگ کی پائنتی کے پاس دیواری الماری کے نیچے تپائی کے اوپر ایک خوبصورت

ٹائم پیس، گرائپ واٹر کی بوتل اور اوولٹین کا ڈبہ جیسی چیزیں پڑی ہیں۔

دو دروازے ہیں ایک تو ان سیڑھیوں کے اوپر کھلتا ہے جو نیچے گلی میں جاتی ہیں اور دوسرا استونوں کے سامنے ہے۔ اس کی دوسری طرف باورچی خانہ ہے ان کے علاوہ سیڑھیوں والے دروازے کے پاس ایک کھڑکی بھی ہے جو گلی میں کھلتی ہے۔ اس وقت کھڑکی اور دونوں دروازے کھلے ہیں۔

ابھی شام ہونے میں کچھ دیر باقی ہے۔ کمرے میں کوئی شخص موجود نہیں، پردہ اٹھنے کے چند لمحوں بعد رکھی باورچی خانے سے آتی ہے۔ رکھی ایک دُبلی پتلی عورت ہے۔ سر کے بال پک چکے ہیں، ہاتھ میں فیڈر رہے جسے وہ تپائی کے اوپر رکھ دیتی ہے اور خود جھولنے کے پاس جاکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ دو تین لمحے وہاں ٹھہرنے اور خالی جھولنے کو ہلانے کے بعد وہ سیڑھیوں والے دروازے کی طرف جاتی ہے۔ اور نیچے سیڑھیوں پر نظر ڈالتی ہے۔

حناں آتی ہے۔ حناں رکھی کی ہم عمر ہوگی۔ صحت رکھی سے بھی خراب ہے۔ حناں نے دونوں ہاتھوں میں دیگچی اٹھا رکھی ہے اوپر آکر وہ دیگچی فرش پر رکھ دیتی ہے اور ہانپنے لگتی ہے۔

حناں: توبہ۔ خالص دودھ آبِ حیات ہوگیا ہے، آج کل!

رکھی: پر اتنا دودھ کرنا کیا ہے، ڈیڑھ سیر تو پہلے ہی گھر میں ہے۔ کیا بہو اور پوتے کو دودھ میں نہلانے کا ارادہ ہے تمہارا!

حناں: تمہیں کیا خبر رکھو! زچہ روٹی ووٹی تو زیادہ کھاتی نہیں دودھ ہی پر جیتی ہے اور پھر اسے بچے کو بھی دودھ پلانا ہوتا ہے۔

رکھی: (طنزاً) جی ہاں مجھے کیا خبر ہوگی۔ یہ سات پوتے پوتیاں تو آسمان سے گرے ہیں نا۔

حناں: اللہ رکھے سب پھولیں پھلیں (مسکراکر) سو سو برس کی عمر پائیں۔

رکھی: آمین!

حناں: میں کہتی ہوں رکھو! بہو زیادہ دودھ پیئے گی تو بچہ بھی موٹا تازہ ہو جائے گا۔ خوب گورا چٹا (تصویر کی طرف اشارہ کر کے) اس جاپانی بچے جیسا۔

رکھی: ہو جائے گا، تسلی رکھو۔

حناں: تم نے فیڈر دھو دیا ہے نا؟

رکھی: ہاں، وہ پڑا ہے تپائی کے اوپر!

حناں: گرم پانی سے دھویا ہے نا؟

رکھی: اوہنوں۔ صاف پانی سے دھویا ہے، دیکھو صاف ہو گیا ہے بالکل اور کیا کہتی ہو؟

(رکھی فیڈر اٹھا کر اسے دکھاتی ہے)

حناں: ہائے میرے ربا! میں نے تاکید کی تھی گرم پانی سے دھونا۔ کیا خبر دکاندار نے کہاں رکھا تھا کیا کچھ الابلا لگا ہو گا اس پر۔

رکھی: تم تو پاگل ہو گئی ہو حناں! کس طرح چمک رہا ہے اور کیا کہتی ہو۔ میں تو ہمیشہ اپنے بچوں کے فیڈر صاف پانی ہی سے دھویا کرتی تھی۔

حناں: یہ صاف تو ہے مگر۔

رکھی: اب تم جانو (اس طرح ہاتھ اٹھا کر جھٹک دیتی ہے جیسے اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں) میں کیا کہوں؟

حناں: اچھا۔ میں دھو لوں گی۔

رکھی: وہمی ہو وہمی۔

حناں: میں وہمی نہیں ہوں رکھو! (آہ بھر کر) تمہیں کیا خبر، ڈاکٹر کیا کہا کرتا تھا۔ (آواز میں غم کی جھلک) کہتا تھا۔ مائی تیرا لڑکا ٹھیک ہو جائے گا۔ پرہیز کی بڑی ضرورت ہے۔ برتنوں کو ذرا گرم پانی سے دھو لیا کر۔ اس سے جراثیم مر جاتے ہیں۔ ہر روز سارے برتنوں کو گرم پانی سے دھویا کرتی تھی۔ پر تقدیر ہی پھوٹ گئی!

رکھی: وہی ہوتا ہے بہن جو اللہ کو منظور ہوتا ہے!

حسناں: اللہ کو یہی منظور تھا (پھر آہ بھر کر) آج میرا شفیع زندہ ہوتا تو کتنا خوش ہوتا۔ اس کی بیوی گود میں بچہ لے کر میکے سے آرہی ہے — پر وہ دنیا میں ہے ہی نہیں (دوپٹے کے دامن سے ناک پونچھتی ہے)

رکھی: صبر کرو بہن! اللہ رکھے یہی محمود، کل جوان ہو جائے گا —— بہو نے لکھا کیا ہے؟

حسناں: (اپنے خیال میں) صبر ہی کرنا ہوگا۔

رکھی: میں نے کہا بہو نے کیا لکھا ہے؟

حسناں: بہو نے — کیا کہا — لکھا کیا ہے؟ — اس نے تو کچھ بھی نہیں لکھا۔ شرماتی ہے۔ بڑی شرم والی لڑکی ہے۔ اس کے بھائی نے لکھا ہے بچہ بڑا خوب صورت اور پیارا ہے۔

رکھی: جیتا رہے۔ سو برس جئے!

حسناں: بہو کی ماں نے لکھا ہے، بچے کی شکل بالکل باپ جیسی ہے!

رکھی: اسے دیکھ کر شفیع کو بھول جاؤ گی حسناں!

حسناں: جواں مرگ بیٹے کو کیسے بھول سکتی ہوں رکھو — د!

رکھی: دیکھ لینا دل بہل جائے گا، جیراں کی طرح، جیراں کو جانتی ہو نا۔ وہی تو دائی مراد کی بڑی بہن (آہ بھر کر) بڑی تقدیر — اس کا لڑکا بھی ہمارے شفیع کی طرح تھوڑے ہی دن بیمار رہ کر مر گیا تھا۔ تین مہینے بعد اللہ نے جیراں کو پوتی دے دی۔ دل بہل گیا۔ اب رات دن اسی کے چاؤ چونچلوں میں لگی رہتی ہے۔

حسناں: نوازش کرتے دے گیا ہے بچے کے؟ (دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہے)

رکھی: ہاں! بارہ ہیں نا؟

حسناں: گن لئے تھے؟

رکھی: گنے بغیر کیسے کہہ سکتی ہوں کہ بارہ ہیں!

حناں: رکھے کہاں ہیں؟

رکھی: اسی نیلے ٹرنک میں (آگے جا کر پلنگ کے نیچے سے نیلے رنگ کا ٹرنک نکالتی ہے)
اسی میں بچے کی چیزیں ہیں نا؟

حناں: ٹھیک ہے —— اور سراج مٹھائی بھی دے گیا تھا؟

رکھی: واہ ادھر باورچی خانے میں ہے —— اتنی ساری مٹھائی کاہے کو منگوائی ہے؟

حناں: میں نے سوچا بہو اور بچے کو دیکھنے کے لئے ہمسائیاں آئیں گی، بچے آئیں گے، ان کے لئے کچھ منگوا رکھوں۔

رکھی: میرے تو منہ میں ابھی سے پانی بھر آیا ہے۔

حناں: تھوڑی نہیں ہے۔ پیٹ بھر کر کھا لینا —— ہائے میرے اللہ!

رکھی: کیا ہے؟

حناں: شام ہو چلی ہے۔ ابھی کتنا کام باقی ہے۔ فیڈر دھونا ہے۔ دودھ ابالنا ہے اور ——

رکھی: تم تو خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔

حناں: گاڑی آتی کتنے بجے ہے؟

رکھی: سو مرتبہ تو بتا چکی ہوں ساڑھے چار بجے —— ساڑھے چار بجے۔ بار بار بھول جاتی ہو!

حناں: ذرا وقت دیکھو، ساڑھے پانچ بج گئے ہیں!

رکھی: دس مرتبہ کہہ چکی ہوں گاڑی کبھی کبھی لیٹ بھی ہو جاتی ہے۔ بس آ ہی رہے ہونگے وہ لوگ۔ ابھی دیکھنا یہاں میلہ لگ جائے گا!

حناں: باورچی خانے کا کام تو ختم ہو گیا ہے نا؟

رکھی: ختم ہی سمجھو!

حسناں : دیکھنا بابا کچھ رہ نہ جائے!

رکھی : بالکل (بالکل پر خاص زور دے کر) بے فکر رہو!

حسناں : اچھا لالٹین جلا دو!

رکھی : میں نے کہا بہو یہ ٹھاٹھ دیکھ کر حیران ہی تو رہ جائے گی۔

حسناں : حیران کیا ہو گی؟

رکھی : یہ جھولنا (تپائی کی طرف اشارہ کر کے) یہ چیزیں ——— اور نیچے کے کپڑوں سے بھرا ہوا ٹرنک اور کیا چاہیئے اسے؟

حسناں : اب زیادہ باتیں نہ کرو۔ تھوڑا سا کام کر کے بھاگو یہاں سے۔

رکھی : کہاں؟

حسناں : اپنے گھر جاؤ!

رکھی : اچھا جی ——— سارا دن کام کرتی رہی۔ اب کھانے کا وقت آیا تو لاڈلی بی بی فرماتی ہیں بھاگو اپنے گھر ہونھہ۔

حسناں : اوہو ——— تم تو الٹی بات ہی سمجھتی ہو۔ میں نے صرف یہ کہا ہے، گھر سے ہو آؤ۔ صبح سے کام کر رہی ہو!

رکھی : اب تو مزے دار چیزیں کھا کر ہی جاؤں گی!

حسناں : ضرور کھانا۔ یہ تمہارا ہی تو گھر ہے!

(حسناں دودھ والی دیگچی اٹھا کر باورچی خانے کی طرف جاتی ہے۔ اس کے پیچھے رکھی بھی لالٹین لے کر جانے لگتی ہے۔ کمرہ خالی ہو جاتا ہے۔ ——— چند لمحوں کے بعد رکھی لالٹین جلا کر واپس آتی ہے۔ لالٹین وہیں ستون کے ساتھ لٹکا دیتی ہے ——— اور جھولنے کے پاس ٹھہر کر آہستہ آہستہ جھولنے کو جھلانے لگتی ہے۔ صغریٰ آتی ہے۔ دس گیارہ سال کی بچی۔ گردن میں ڈھولک لٹک رہی ہے)

رکھی : آؤ صغریٰ!

صغریٰ : خالہ! آپا نہیں آئی؟

رکھی : آجائے گی!

صغریٰ : شام تو ہوگئی ہے۔

رکھی : گاڑی لیٹ بھی ہو جاتی ہے کبھی کبھی!

صغریٰ : ہم ڈھولک بجائیں گے ـــــ ہاں۔

رکھی : ضرور بجانا ـــــ اور سنو! بہت سے بچوں کو لے کر آنا۔

صغریٰ : سارے (سارے کو لمبا کر کے) محلے کے بچوں کو لے کر آجاؤں گی۔ ہاں۔ آپ نے سمجھا کیا ہے خالہ؟

رکھی : ہمارے پاس سارے محلے کے بچوں کے لئے مٹھائی نہیں ہے بابا!

صغریٰ : مٹھائی ـــــ آہا (خوشی سے ڈھولک پر زور زور سے ہاتھ مارتی ہے)

رکھی : اب تو خوش ہوگئی ہے نا!

صغریٰ : خالہ! (سنجیدہ منہ بنا کر) بعض بچے بڑے بدتمیز ہوتے ہیں۔ میں صرف اپنی بہنوں ہی کو لاؤں گی (شور کرنے سے فائدہ بھلا!

رکھی : کیوں۔ باقی بچوں نے کیا قصور کیا ہے؟

صغریٰ : (موضوع بدل کر) اچھا خالہ! ـــــ بچہ ـــــ بڑا ـــــ بڑا پیارا ہے نا!

رکھی : ہاں! سنا تو یہی ہے!

صغریٰ : اچھا خالہ! میں موڑ پر جا کر انتظار کرتی ہوں آپا کا ـــــ جب انہیں دیکھوں گی تو بھاگ کر آپ کو بتا دوں گی!

رکھی : اچھا!

(صغریٰ سیڑھیوں کی طرف جاتی ہے۔ رکھی وہیں کھڑی ہے۔ حناں آتی ہے۔)

(وقفہ)

حناں : صغریٰ ہوگی ——— صبح سے کئی مرتبہ آچکی ہے رٹائم پیس دیکھ کر لہجے میں گھبراہٹ)
ہائے اب تو پونے چھ بج گئے۔ کیوں نہیں آئے اب تک کہیں گھڑی تو آگے نہیں۔ پر
نہیں۔ کافی اندھیرا ہو گیا ہے۔ کیوں رکھو!

(رکھی کسی گہری سوچ میں غرق ہے)

تم سوچ کیا رہی ہو!

رکھی : کیا کہا۔؟

حناں : میں نے کہا سوچ کیا رہی ہو!

رکھی : میں ——— کیا سوچ رہی ہوں ؟ کچھ نہیں۔ یونہی

حناں : یونہی کیا ؟

رکھی : سوچ رہی ہوں کہ انسان کو زندہ رہنے کے لئے کیسے کیسے سہارے مل جاتے ہیں۔
ایک سہارا ٹوٹ جاتا ہے تو دوسرا سہارا مل جاتا ہے، بٹیا نہ سہی پوتا ہی سہی۔ پر صدمہ
تو سہنا ہی پڑتا ہے نا۔

حناں : رکھو! ماں کا دل تو ایک سمندر ہوتا ہے۔ ایک اتھاہ سمندر۔ جس میں دکھوں اور غموں
کے ہزاروں پہاڑ چپ چاپ سما جاتے ہیں ——— دیکھنے والوں کو معلوم ہی نہیں ہوتا
کہ اس سمندر کی تہ میں کیا کچھ ڈوب چکا ہے۔ ماں تو دُکھ سہنے اور صبر کرنے کے لئے ہی پیدا
ہوئی ہے رکھو!

رکھی : (آہ بھر کر) سچ کہا ہے تم نے!

حناں : یہی دیکھ لو۔ پورے نو مہینے ہم اپنی رگوں کا خون دے دے کر ایک بے جان چیز
کو جاندار بناتی ہیں پھر اپنے سینے کے لہو کو دودھ بنا کر اسے پالتی ہیں اس کی خاطر دن کا
چین اور رات کا آرام تج دیتی ہیں۔ مگر وہ ——— ہمارے جگر کا ٹکڑا ہم سے ہمیشہ
کے لئے چھن جاتا ہے (آہ بھر کر) کیا کریں۔ زندہ تو رہنا ہی پڑتا ہے۔ صبر تو کرنا ہی

پڑتا ہے۔

رکھی: استغفر اللہ، ہم بھی کیا باتیں لے بیٹھی ہیں اس وقت!

حناں: قدرت کا کارخانہ تو اسی طرح چلتا ہے۔

رکھی: چلنے دو ہمیں کیا؟ یہ بتاؤ کوئی اور کام باقی تو نہیں۔

(نیچے سے شبیر کی "اماں" کہتی ہوئی آواز آتی ہے)

حناں: شبیر معلوم ہوتا ہے!

رکھی: وہی ہے (آواز دے کر) آؤ شبّی!

(شبیر آتا ہے۔ سن اٹھارہ کے لگ بھگ)

شبیر: ابھی آپا نہیں آئی؟

رکھی: آتی ہوئی تو نظر نہ آ جاتی!

شبیر: اماں! شیخ صاحب کے گھر کے لوگ بھی اسی گاڑی سے آ رہے تھے۔

حناں: تو آ گئے وہ ——— تمہارا خالو تو آیا نہیں ابھی۔ جانے کہاں جا کر بیٹھ گیا ہے۔

شبیر: ایک بہت بری خبر سنی ہے خالہ!

حناں اور رکھی۔ (ایک ساتھ) کیا؟

شبیر: شیخ صاحب کہتے ہیں۔ اس گاڑی کی ٹکر ہو گئی ہے۔

حناں: ٹکر ——— ہائے میرے اللہ!

رکھی: خدا خیر کرے۔ کہاں ہوئی ہے ٹکر؟

شبیر: اسٹیشن کے قریب ——— گاڑی زخمیوں کو لے کر آ پہنچی ہے!

حناں: تمہاری آپا اور بچے کا کیا ہوا؟ شیخ صاحب کیا کہتے ہیں؟

شبیر: وہ اپنے گھر والوں کو لے آئے ہیں۔ صرف ان کے ابا کچھ زخمی ہوئے ہیں!

حناں: میں جاتی ہوں۔ برقعہ کہاں ہے (الماری کی طرف جانے لگتی ہے۔ رکھی اٹھ کر اس کا

ہاتھ پکڑ لیتی ہے)

رکھی : تم کہاں جاؤ گی حناں ؟ ذرا ٹھہرو۔ بات سنو میری!

حناں : (لہجے میں سخت گھبراہٹ) بات کیا سناؤ گی ؟

رکھی : بیٹھ جاؤ۔ شبی چلا جاتا ہے!

شبیر : میں جاتا ہوں اماں! ابھی آکر بتاتا ہوں

رکھی : بھاگ کر جاؤ۔ اللہ رحم کرے گا۔

(شبیر جلدی سے سیڑھیوں پر سے اترنے لگتا ہے۔ چند لمحے سناٹا چھایا رہتا ہے)

حناں : شیخ صاب ہی کے گھر چلی جاؤں ؟

رکھی : انہیں کیا خبر ہو گی ہماری ؟ گھبراؤ نہیں۔ گاڑی کی ٹکر ہو جائے تو سارے کے سارے مسافر زخمی نہیں ہو جاتے۔ اور پھر عورتوں کا ڈبہ تو انجن سے کافی دور ہوتا ہے۔

حناں : خدا کرے وہ اس گاڑی سے نہ آئی ہو!

رکھی : یہ بھی ہو سکتا ہے!

حناں : نہیں اسی گاڑی سے آئی ہے۔ اس کے بھائی نے لکھا تھا۔ میں سعیدہ کو اس گاڑی میں سوار کرا دوں گا۔

رکھی : اس کے ساتھ اس کے رشتے کی کوئی خالہ بھی تو آرہی تھی۔

حناں : ہاں!

رکھی : خط میں صاف لکھا تھا۔ اگر خالہ ساتھ جانے پر تیار ہوئی تو سعیدہ آئے گی۔ ورنہ میں اگلے مہینے خود اسے چھوڑ جاؤں گا۔ لکھا تھا نا؟

حناں : خالہ ضرور آئی ہو گی!

رکھی : کیا خبر ——— پر میرا دل کہتا ہے وہ اس گاڑی سے نہیں آئی۔ اگلے مہینے اس کا بھائی ہی لے کر آئے گا اسے۔

حناں : جب خط میں لکھ دیا ہے تو۔

رکھی : ہو سکتا ہے اس کی خالہ تیار نہ ہو سکی ہو۔

(حناں اس کا منہ تکنے لگتی ہے)

حناں : میرا دل نہیں مانتا۔

رکھی : ابھی شبیر آجاتا ہے۔ وہ آکر یہی کہے گا کہ خالو جان اکیلے آرہے ہیں۔ دیکھ لینا!

(سیڑھیوں پر آہٹ)

آرہا ہے کوئی (بلند آواز سے) شبّی!

(صغریٰ آتی ہے)

صغریٰ : (لہجے میں افسوس) خالہ!

حناں : کیا؟

صغریٰ : وہ ——— خالو آپا کو نہیں لائے!

رکھی : (آواز میں خوشی) نہیں لائے!

صغریٰ : بڑی آئی آپا کہیں کی ——— اس گاڑی سے آئی ہی نہیں۔

رکھی : اللہ تیرا شکر ہے ——— شکر ہے تیرا (حناں سے) شکر کرو بہن!

حناں : شکر ہے لاکھ بار شکر ہے۔

(صغریٰ حیرت سے ان دونوں کو دیکھنے لگتی ہے)

رکھی : میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ سعیدہ اس گاڑی سے نہیں آرہی۔

حناں : تم تو "اولیا" ہوگئی ہو بہن!

(عباس آتا ہے۔ لمبا تڑنگا آدمی۔ عمر پچاس کے قریب)

عباس : توبہ اسٹیشن پر جو حشر دیکھا ہے آج۔ کبھی نہیں بھول سکتا۔

حناں : سعیدہ نہیں آئی؟

عباس : اس گاڑی سے نہیں آئی۔ اور یہ بہت اچھا ہوا ہے ——— اس گاڑی ———

حسناں : سارے ڈبے دیکھ لیے تھے نا؟

رکھی : کیسی پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ سارے ڈبے دیکھنے کی کیا ضرورت تھی؟

عباس : عورتوں کے دونوں ڈبے اچھی طرح دیکھ لئے تھے!

حسناں : نہیں آئی نا؟

عباس : کہہ تو دیا ہے نہیں آئی (آہ بھر کر) توبہ! بہت بڑی ٹکر ہوئی ہے۔ بے شمار آدمی زخمی ہو گئے ہیں۔

رکھی : حسناں! اب مٹھائی وغیرہ کا کیا ہوگا؟

حسناں : یہ بچوں کا حصہ ہے ——— باقی سب کچھ تم کھالینا!

رکھی : چلو یوں ہی سہی (صغریٰ سے مخاطب ہو کر) صغریٰ! جا بیٹی گلی کے بچوں کو بلا ———

(صغریٰ نیچے اترنے لگتی ہے)

حسناں : میں دودھ چولہے سے اتار دوں!

(حسناں باورچی خانے والے دروازے میں سے نکل جاتی ہے)

رکھی : بہو اس گاڑی سے آجاتی تو نہ جانے ———

عباس : کیا کہوں ہر ڈبے سے زخمیوں کو نکالا جا رہا تھا ———

رکھی : حسناں تو سٹیشن پر جانے کو تیار ہو گئی تھی۔ وہ تو میں نے روکا۔

عباس : بے چاری نے بڑا دکھ اٹھایا ہے۔ پر ہے بڑے صبر والی!

(صغریٰ آتی ہے)

رکھی : کیوں صغریٰ! اتنی جلدی آگئی ہو، بچے کہاں ہیں؟

صغریٰ : آرہے ہیں ——— اور یہ تار آیا ہے۔

عباس : یا اللہ خیر (تار صغریٰ کے ہاتھ سے لے کر پڑھتا ہے۔ پڑھتے ہی اس کا چہرہ فق ہو جاتا ہے)

رکھی : کیا لکھا ہے؟ (زیادہ بے تابی سے) کہاں سے آیا ہے؟

(نیچے سے بچوں کا شور سنائی دیتا ہے)

عباس : بچہ ——— !

رکھی : کیا ہوا بچے کو ؟

عباس : مر گیا ہے !

رکھی : مر گیا ——؟ ہائے میرے اللہ (سینے پر دو ہتڑ مارتی ہے)

حناں : (باورچی خانے سے) رکھو ! بچے آئیں تو انہیں یہیں بھیج دینا !

(عباس اور رکھی کسمپرسی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ صغریٰ چپ چاپ ٹکر ٹکر تک رہی ہے۔ سیڑھیوں سے بچوں کا شور بڑھتا جا رہا ہے)

(پردہ جلدی سے گرتا ہے)

بچہ گاڑی

کردار

مہران ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بیوی

سراج ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شوہر

رحمت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہمسائی

گڈو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مہران اور سراج کا شیر خوار بچہ

منظر

(ایک مستطیل نما، تنگ، تاریک اور گندہ کمرہ، اِدھر اُدھر مٹی اور ایلومینیم کے برتن، خالی بوریاں، کنستر اور میلے کچیلے کپڑے بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ کمرہ ایک پورے مکان کا کام دیتا ہے، یہاں کھانا بھی پکایا جاتا ہے، کھایا بھی جاتا ہے اور سردی ہو یا گرمی، رات کو سویا بھی جاتا ہے۔

فروری کی ایک رات کا پہلا پہر۔ سردی ختم ہو رہی ہے۔ مگر ابھی ہوا میں خنکی باقی ہے۔

کمرے کے وسط میں ایک چارپائی کے اوپر، جس پر ایک دری بچھی ہے، مہراں بیٹھی ہے، بائیں ہاتھ میں چاولوں کی تھالی ہے اور دائیں ہاتھ سے کھا رہی ہے، گود میں بچہ ہے جو چادر میں لپٹا ہوا ہے۔ مہراں ستائیس اٹھائیس برس کی عورت ہے، مگر جیسا کہ اس طبقے کی عام عورتوں کا خاصہ ہے، وہ اپنی اصلی عمر سے کم از کم آٹھ سال بڑی نظر آ رہی ہے۔ مہراں کی چارپائی سے کچھ دور ایک جھلنگا چارپائی بچھی ہے۔ اس چارپائی کے سرہانے کی طرف کنستروں کے اوپر ایک لالٹین پڑی ہے۔ لالٹین کی روشنی اتنی تیز نہیں کہ کمرے کے بعیدی گوشوں کی تمام چیزیں واضح طور پر نظر آ سکیں۔ صرف قریبی چیزیں

دکھائی دے رہی ہیں۔ تھالی میں اب تھوڑے سے چاول باقی رہ گئے ہیں۔ مہراں ذرا جھک کر زمین پر سے پانی کا گلاس اٹھاتی ہے۔ اور بغیر سانس لئے اسے خالی کر کے دوبارہ زمین پر رکھ دیتی ہے۔ دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ مہراں تھالی جھلنگا چارپائی پر رکھ دیتی ہے اور منہ موڑ کر پوچھتی ہے:

"کون ہے ؟"

اب کے دستک کے ساتھ، مہراں، کہتی ہوئی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ (مہراں آواز پہچان لیتی ہے۔ چارپائی سے اُٹھ بیٹھتی ہے اور "اچھا چاچی" کہہ کر دروازے کی طرف جاتی ہے۔ روشنی کم ہونے کی وجہ سے دروازہ نظر نہیں آتا، چند لمحوں کے بعد جب وہ دوبارہ روشنی میں آئے گی۔ تو اس کے ساتھ ادھیڑ عمر کی ایک عورت بھی ہوگی جس کا نام رحمت ہے لیکن جسے مہراں احتراماً "چاچی" کہہ کر پکارتی ہے۔ رحمت ساتھ والے گھر میں رہتی ہے)

رحمت: (دستک) مہراں ـــــ مہراں

(دروازہ کھلتا ہے)

مہراں: گھر سے آئی ہو چاچی۔

رحمت: اور کہاں سے آؤں گی؟

مہراں: بیٹھ جاؤ ذرا۔

رحمت: بیٹھوں گی کیا، ابھی کتنا ہی دھندا پڑا ہے۔ کرنے کو۔ ساجو کہاں ہے ؟

مہراں: (چارپائی پر بیٹھتے ہوئے) دیر ہوئی باہر گیا ہے۔

رحمت: شام کو تو وہ گھر سے باہر جایا نہیں کرتا۔

مہراں: گڈو کے لئے کچھ خریدنے گیا ہے۔

رحمت: کیا چیز؟

مہراں: اللہ جانے، بتا کر تو کچھ گیا نہیں۔

رحمت: کپڑا ادھڑا لینے گیا ہوگا۔

مہراں: کیا پتہ پینتیس کی رقم لے کر گھر سے نکلا ہے۔ جو من میں آئے گا لے آئے گا۔

رحمت: (حیرت سے) پینتیس روپے!

مہراں: ہاں چاچی! کہتا تھا یہ رقم تھوڑی ہے، جو کچھ لانا چاہتا ہوں، وہ بڑی قیمتی شے ہے۔

رحمت: کیا ہوگی وہ شے؟

مہراں: کیا جانوں؟ رات کے دو دو بجے تک بیٹھ کر کام کرتا رہا ہے۔ جب کہیں جا کر تنے پیسے جمع ہوئے ہیں، کہتا تھا اپنے گڈو کے لئے ایسی شے لاؤں گا کہ حیران رہ جاؤ گی (پیار کی نظروں سے سوئے ہوئے بچے کو دیکھتی ہے) جی ہاں۔

رحمت: شے کیا ہوئی سرخاب کا پر ہوگیا ——— آئے گا کب؟

مہراں: بس آہی رہا ہوگا۔ بڑا خوش خوش گیا ہے گھر سے۔

رحمت: اچھا۔ آئے تو دیکھوں کیا شے پسند کر کے لایا ہے؟

مہراں: چاچی! گڈو ابھی آیا بھی نہیں تھا کہ کہا کرتا تھا۔ اللہ وہ دن کب آئے گا جب میں بچے کے لئے وہ شے خرید کر لاؤں گا۔ (ہنس پڑتی ہے)

رحمت: (مسکرا کر) تماشا ہے یہ تمہارا ساجو بھی!

مہراں: اور کیا ——— مجھے بھی تو نہیں بتایا کچھ!

رحمت: کچھ لے ہی آئے گا ——— ایک چیز کیا بہت سی چیزیں لا سکتا ہے۔ کافی پیسے ہیں۔

مہراں: پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے چار پانچ بجے گھر سے نکلا تھا۔ اکیلی بیٹھی ہوں۔

رحمت: ذرا خبردار رہا کرو رات کو۔ سمجھ لیا نا۔

مہراں: اچھا چاچی!

رحمت: صبح دیکھیں گے تمہارے گڈو کی عجیب شے ——— سو رہا ہے؟

مہراں: ابھی ابھی سویا ہے ——— بیٹھو نا چاچی۔

رحمت: نا بہن! میرا دھندا کون کرے گا!

(رحمت جانے لگتی ہے کچھ دور جا کر ٹھہر جاتی ہے)

دروازہ بند کر لینا۔

مہراں: اچھا چاچی!

(رحمت اندھیرے میں غائب ہو جاتی ہے، مہراں بچے کو چارپائی پر لٹاتی ہے وہ رونے لگتا ہے۔ بچہ اپنی گود میں اٹھا لیتی ہے اور اسے سلانے لگتی ہے۔

"باس باس، میرے لال۔ باس۔"

بچہ سو جاتا ہے، مہراں اسے چارپائی پر لٹا کر چند لمحے تھپتھپاتی رہتی ہے۔ دروازے سے ایک مردانہ آواز آتی ہے۔ "مہراں" مہراں چارپائی سے اٹھ کر دروازے کی طرف جاتی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازے پر پہنچے سراج روشنی میں آجاتا ہے۔ سراج کی عمر پینتیس چھتیس برس کے لگ بھگ ہو گی۔ جسم مضبوط اور گٹھا ہوا۔ وہ ایک بچہ گاڑی اٹھائے ہوئے آرہا ہے)

مہراں: (لہجے میں گھبراہٹ ہے) ہائے یہ کیا لے آئے؟

سراج: تم تو ڈر ہی گئی ہو۔ دیکھتیں نہیں اپنے گڈو کے لئے بچہ گاڑی لایا ہوں۔ کتنی خوبصورت ہے، دیکھو! ——— کسی نواب صاحب کا بچہ معلوم ہو گا اس میں بیٹھ کر۔

(سراج تحسین طلب نظروں سے بیوی کو دیکھتا ہے، مہراں کچھ حیران کھڑی ہے)

ایک کم چالیس کی لایا ہوں، میرا گڈو اس میں بیٹھے گا تو دیکھنا کتنا خوش ہو گا۔ وہ پینتالیس سے کم دیتا نہیں تھا۔ میں نے کہا بھائی میرے پاس تو یہی کچھ ہے۔ چار روپے میرے بھی اُڑ گئے۔ اس مہینے بیڑیوں سے بھی جواب۔ خیر

مہراں : کچھ اور نہیں لا سکتے تھے۔

سراج : کیا کہہ رہی ہو۔ کچھ اور کیوں لاتا بھلا روپے اسی کے لئے تو جمع کئے تھے۔

مہراں : —— ایک کم چالیس —— پورے چالیس ہوئے نا۔

سراج : چیز بھی تو دیکھو۔ اتنی خوب صورت بچہ گاڑی تو اپنے ڈاکٹر کے بچے کی بھی نہیں ہے۔ (لالٹین کی بتی اونچی کرتا ہے) لو اب دیکھو روشنی میں! چپ چاپ کیوں ہو۔ اللہ اور دے گا! پیسوں کا کیا غم ہے —— یہ تو ہاتھ کی میل ہوتے ہیں۔ یہی غم ہے نا۔

مہراں : نہیں۔

سراج : تو پھر۔

مہراں : پھر کیا۔ جو چاہتے تھے لے آئے ہو۔ بات ختم۔ بس۔

سراج : میں تو سمجھتا تھا تم خوشی سے اچھل پڑو گی —— روز سیر کراؤں گا، گڈو کو۔ لاؤ ذرا بٹھاؤں۔

مہراں : سو رہا ہے نہ جگاؤ کچی نیند میں۔

سراج : پھر سو جائے گا۔

(بچے کو اٹھا کر گاڑی میں بٹھانے کی کوشش کرتا ہے بچہ جاگ کر رونے لگتا ہے مہراں جلدی سے اٹھا کر چھاتی سے لگا لیتی ہے بچہ خاموش ہو جاتا ہے۔)

مہراں : جاگ پڑا نا۔ باس باس۔ میرا لال۔

سراج : اچھا صبح سویرے سیر کراؤں گا۔

مہراں : سڑک پر نہ لے جانا۔

سراج : کیوں : وہیں تو لے جاؤں گا باغ میں۔

مہراں : سڑک پر تانگے ہوتے ہیں، موٹریں ہوتی ہیں —— بائیسکلیں اور جانے کیا کیا کچھ۔

سراج : ٹرانک تو ہر جگہ ہوتی ہے، اس سے کیا گھبرانا۔

مہراں : (موضوع بدلتے ہوئے) چنگیر کے نیچے چاول پڑے ہیں دال بھی وہیں ہے۔

سراج : مجھے تو بھوک نہیں ہے (جھلنگا چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے) تھک گیا ہوں آج۔

مہراں : پاؤں دبا دوں!

سراج : نہیں۔ تمہیں بھی کہاں آرام ملتا ہے۔ ذرا بتی نیچی کر دو۔

مہراں : اچھا!

(مہراں آہستہ سے بچے کو چارپائی پر لٹا دیتی ہے اسے تھپتھپاتی ہے۔

پھر احتیاط سے ہاتھ ہٹا لیتی ہے۔ اٹھ کر لالٹین کی روشنی نیچی کرتی ہے
روشنی مدھم ہو جاتی ہے پھر وہ چارپائی پر آ کر بیٹھ جاتی ہے)

سراج : میں نے کہا مہراں!

مہراں : ہوں۔

سراج : تم خوش کیوں نہیں ہوئیں۔ مجھے اتنی خوشی ہوئی ہے کہ کیا بتاؤں پوچھو گی کیوں!

مہراں : تم جانو بابا!

سراج : (لمبی آہ بھر کر) جب میں بچہ تھا نا تو اپنے گھر کے سامنے باغ میں امیروں کے بچوں کو گاڑیوں میں دیکھا کرتا تھا۔ نوکرانیاں گاڑیوں کو اِدھر اُدھر پھرایا کرتی تھیں، میرا دل بھی بہت چاہتا تھا کہ کسی گاڑی میں بیٹھوں۔ پر گاڑی آتی کہاں سے۔ ایک دن میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے میاں سے کہا میاں گاڑی لے دو۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ وہ برس پڑا۔ زور سے منہ پر تھپڑ مارا اور دھکا دے دیا۔ میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس رات میں لحاف میں منہ چھپا کر دیر تک روتا رہا۔

میرا بچہ گاڑی میں بیٹھنے کا ارمان کبھی پورا نہ ہوا۔ یہاں تک کہ میں بڑا ہو گیا، میں نے دل میں سوچ لیا کہ مجھے گاڑی میں بیٹھنا نصیب نہیں ہوا تو کیا ہوا۔ اپنے بچے کو ضرور بالضرور بچہ گاڑی خرید کر دوں گا، اور اسے باغ میں سیر کرایا کروں گا۔ جس طرح نوکرانیاں

امیروں کے بچوں کو سیر کرایا کرتی ہیں۔

مہراں: (لہجے میں ہمدردی) تم روتے رہے لحاف کے اندر! ہائے میں مرجاؤں۔

سراج: میاں نے پیٹا جو تھا بُری طرح۔ پروہ بھی سچا تھا۔ پچیس تیس کی گاڑی کہاں سے خرید کر دیتا۔

مہراں: غریبی بھی کتنی بُری چیز ہے ——— پر میں نے کہا گڈو کے ابا

سراج: (اپنے دھیان میں) آج میرا ایک پرانا ارمان پورا ہو گیا ہے۔
صبح جگا دینا ضرور، ہیں ——— رکھا کہاں ہے اسے؟

مہراں: پوریوں کے اوپر

سراج: کوئی چادر اوپر ڈال دیتیں، صبح اس کے لئے کوئی جگہ صاف کر دوں گا اسے رکھا کہاں جائے (سوچتے ہوئے) لکڑیوں والی جگہ نہیں یہ ٹھیک نہیں کوئی کوٹھری ٹھیک رہے گی (سب کچھ الم غلم پھینک دوں گا۔ باہر صاف ستھری جگہ بن جائے گی میرے گڈو کی گاڑی کے لئے ——— مہراں: میری مانو تو گھر کے اندر سیر کرادیا کرو۔

سراج: (ہنس کر) گھر کے اندر سیر، کیسی باتیں کر رہی ہو، گھر بھی کوئی باغ ہے، ہوں صبح باہر لے جاؤں گا، اپنے گڈو کو باغ میں ——— سبز سبز گھاس کے اوپر ——— (نیند غالب آرہی ہے) کھلی — جا — گہ پر ——— ٹھنڈ — ی۔۔۔
۔۔۔ٹھنڈی۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ دا۔۔۔ میں

(سو جاتا ہے، مہراں بھی لیٹ جاتی ہے۔ خاموش فضا میں سراج کے خراٹوں کے سوا اور کوئی آواز نہیں۔ چند لمحے خراٹوں کی آواز ابھرتی رہتی ہے۔

روشنی اور مدھم ہو گئی ہے ہلکی سی روشنی مہراں کے چہرے پر پڑ رہی ہے جو لمبے لمبے سانس رہی ہے، دور سے کلاک کی آواز سنائی دیتی ہے ——— ابھی یہ آواز گونج ہی

رہی ہے کہ مہراں چیخ مار کر جاگ اٹھتی ہے، بچہ زور زور سے
رونے لگتا ہے)

سراج : مہراں ! مہراں !!

(مہراں کوئی جواب نہیں دیتی، بچہ زور زور سے روئے جا رہا ہے، سراج جلدی سے اٹھ کر لالٹین کی بتی اونچی کر دیتا ہے، اب منظر روشنی میں آتا ہے۔ مہراں روتے ہوئے بچے کو چھاتی سے چمٹائے ٹکر ٹکر شوہر کو دیکھ رہی ہے) میں پوچھتا ہوں ہوا کیا ہے، ڈر گئی ہو مہراں ؟

مہراں : ہاں !

سراج : کیوں، کوئی ڈراؤنا سپنا دیکھا ہے ——— اور گڈو کو کیوں اس طرح پکڑ رکھا ہے

(سراج بچے کو اٹھانے کی کوشش کرتا ہے، مہراں اسے اور زیادہ
چمٹا لیتی ہے)

مہراں : توبہ میری، یا اللہ !

سراج : چپ تو کرانے دو بچے کو، اس طرح دباؤ نہیں اسے پھول سا بدن ہے۔

(سراج بچے کو بازوؤں میں اٹھا لیتا ہے)

بس بھائی، بس تو بھی ڈر گیا ہے ماں کے ساتھ بس بس یہ ہوا کیا تھا آخر مہراں ؟

مہراں : کچھ نہیں۔

(بچہ خاموش ہو جاتا ہے)

سراج : کچھ نہیں ! اور یہ چیخ کی آواز کیسی تھی ؟

(مہراں کچھ نہیں کہہ کر پھٹی پھٹی نظروں سے شوہر کو دیکھے جا رہی ہے۔
سراج بچے کو آہستہ سے اس کے پاس لٹا دیتا ہے)

ضرور کوئی سپنا دیکھا ہے۔ ڈراونا سا

مہراں : ایسی منحوس چیز جو لے آئے ہو گھر میں۔

مہراں : پر ــــــــ

سراج : پر کیا۔ بجائے خوش ہونے کے الٹ پلٹ باتیں کرنے لگی ہو۔

مہراں : میں نے دیکھا جو تھا اپنی آنکھوں کے سامنے

سراج : کیا دیکھا تھا ــ خواب میں ــــــــ

مہراں : نہیں، جاگتے ہوئے۔ بالکل ہوش کی حالت میں ــــــ اپنے سامنے!

سراج : دیکھا کیا تھا؟

مہراں : جب میں بچی تھی تو ایک دن بازار سے کوئی چیز خرید نے گھر سے نکلی تھی۔ وہاں ایک آیا بچہ گاڑی لئے جا رہی تھی، ادھر سے موٹر آ رہی تھی ــــــــــ

ہائے میرے اللہ : وہ سماں کبھی نہیں بھول سکتی۔ بچہ خون میں لت پت ــــــــ

سراج : (الفاظ کاٹ کر) یہ تو اس آیا کی غلطی ہو گی، وہ گاڑی کو ادھر کیوں لے گئی تھی۔

مہراں : وہ بچہ مجھے بھولتا ہی نہیں، یہ بچہ گاڑی ہوتی ہی منحوس ہے۔

سراج : بچہ گاڑی ہرگز منحوس نہیں ہوتی۔

مہراں : خریدنے سے پہلے تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں تھا؟

سراج : تم خریدنے سے منع کر دیتیں۔ یہی بات ہے نا!

مہراں : اور کیا۔

سراج : میں تو ہر حالت میں خرید کر لاتا۔

(مہراں اس طرح شوہر کو دیکھتی ہے جیسے کہہ رہی ہو بڑے سنگ دل ہو)

کون روک سکتا ہے مجھے (بیوی کی نظروں سے متاثر ہو کر) دیکھو مہراں، اس طرح وہم نہیں کیا کرتے!

سراج : تم تو پاگل ہو گئی ہو (لہجے میں درشتی)، بچہ گاڑی منحوس ہے۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟

مہراں : منحوس نہیں تو اور کیا ہے۔ کوئی اور چیز نہیں لا سکتے تھے تم؟

سراج: اس میں کیا برائی ہے آخر!

مہراں: میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔

سراج: رہمدردی ہے) ضرور کوئی سپنا دیکھا ہے۔

مہراں: ایک گھونٹ پانی دینا۔

سراج: اچھا ——— رکمرے کے ایک گوشے میں چلا جاتا ہے اور گلاس لے کر آتا ہے)

مہراں: رگلاس ہاتھ میں پکڑتے ہوئے) توبہ میرے اللہ! رپانی پیتی ہے اور گلاس زمین پر رکھ دیتی ہے) توبہ میری۔

سراج: کیا ہوا تھا؟

مہراں: میں نے دیکھا گڈو کو اس گاڑی میں سڑک پر لئے جا رہے ہو۔ ادھر سے ایک موٹر آجاتی ہے اور ———

سراج: کتنی وہمی ہو، میرا دماغ خراب ہو گیا ہے جو گاڑی کو موٹر کے راستے پر لے جاؤں گا۔ تم نے بچہ گاڑیوں کو آتے جاتے ہوئے نہیں دیکھا کبھی، ڈاکٹر ہی کے دونوں بچے روز گاڑیوں میں بیٹھ کر سیر کرتے ہیں، روز نوکر دونوں گاڑیوں کو باہر لے کر جاتے ہیں۔ کبھی کچھ ہوا ہے ان کے ساتھ؟

مہراں: خرید کیوں لائے ہو تم؟

سراج: بتا تو چکا ہوں۔ خود کبھی گاڑی میں نہ بیٹھ سکا۔ سوچا اپنے بچے ہی کو گاڑی میں بٹھا کر ارمان پورا کر لیں گے ——— بتایا نہیں تمہیں!

مہراں: مجھے ڈر آتا ہے۔

سراج: تم تو وہمی ہو، وہم کا علاج تو لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔

مہراں: اسے واپس کر دو تو کتنی اچھی بات ہو۔

سراج: واپس! ——— وہ کیوں؟

مہراں: کہہ تو دیا ہے ڈر آتا ہے۔ مجھے۔ دل ڈوب رہا ہے۔

سراج : دل کا کیا ہے، ٹھیک ہو جائے گا۔

مہراں : (خوشامدانہ لہجے میں) دیکھو گڈو کے ابا ——— جو کچھ میں کہتی ہوں وہی کرو، تم بڑے اچھے ہو۔

سراج : جی نہیں، میں بہت بُرا ہوں۔

مہراں : بُرے نہیں تو اور کیا ہو؟ اتنی سی بات بھی نہیں مانتے۔

سراج : مانوں کیوں، کوئی وجہ بھی تو ہو!

مہراں : اس سے بڑھ کر اور کیا وجہ ہو گی کہ مجھے ڈر آتا ہے۔

سراج : تو میں کیا کروں، تمہیں تو یونہی ڈر آرہا ہے۔

مہراں : واپس کر دو۔ دکاندار لے لے گا۔ دو چار کم پر ہی سہی۔

سراج : واہ! حکم کس طرح سنایا جا رہا ہے۔

مہراں : حکم نہیں گڈو کے ابا۔ سچ میرا دل بُری طرح ڈوب رہا ہے۔ میں نے کبھی جھوٹ بولا ہے تمہارے آگے۔

سراج : دل کو قابو میں رکھو نا!

مہراں : تم واپس کر کے کچھ اور لے آؤ تو کیا ہرج ہے۔ بازار میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔

سراج : اتنے شوق سے خرید کر لایا ہوں، اور اب واپس کر دوں۔ کیا سمجھ رکھا ہے۔ مجھے تو نے؟

مہراں : مجھے بتایا جو نہیں تھا خریدنے سے پہلے۔

سراج : میں ہرگز واپس نہیں کروں گا۔

مہراں : تو میں گڈو کو اس میں بیٹھنے نہیں دوں گی۔ بات ختم۔

سراج : تم کون ہو روکنے والی؟

مہراں : ماں ——— ماں کا کوئی حق ہی نہیں ہے جس نے اسے نو مہینے اپنے پیٹ میں رکھا۔ اپنا خون دے کر پالا پوسا۔

سراج : اور میرا کوئی حق نہیں ہے تم رات کے دو دو بجے تک بیٹھ کر کتابوں کی جلد بندی کرتی رہی ہونا۔

مہراں : ہائے اللہ! میں نے کب کہا تمہارا کوئی حق نہیں۔

سراج : اور کس طرح کہو گی؟

مہراں : میں نے تو صرف یہ کہا ہے کہ یہ چیز منحوس ہے۔

سراج : منحوس تم خود ہو، گاڑی کیوں منحوس ہونے لگی بھلا۔

مہراں : اچھا، تو میں گڈو کو نہیں بٹھاؤں گی، خالی گاڑی لے جانا —— جہاں جی چاہے لے جانا۔

سراج : دیکھوں گا کس طرح روکتی ہو مجھے؟

مہراں : نہیں جانے دوں گی، کوئی زبردستی ہے۔

سراج : صبح تو ہونے دو۔

مہراں : باپ کاہے کو ہو دشمن ہو۔

سراج : چلو میں دشمن ہی سہی۔

مہراں : دشمن نہیں تو اور کیا ہو۔ پکے دشمن ہو بچے کے۔

سراج : بک بک بند بھی کرو اب لوگوں کو سونے دو، صبح جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

مہراں : میرا تو کوئی حق ہی نہیں ہے یہاں۔ خدا جانے کیوں بیٹھی ہوں اس گھر میں۔

(مہراں رونے لگتی ہے بچہ جاگ اٹھتا ہے اور بے اختیار رونے لگتا ہے)

سراج : توبہ! اس عورت نے تو میری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔ خوب روؤ، تمام رات روتی رہو، اور اسے بھی رلاتی رہو۔ آرام نہ کرنے دینا کسی پاجی کو۔

مہراں : روؤں نہ تو —— اور کیا کروں —— ایسا ظالم۔ سنگ دل۔

سراج : (گرج کر) میں کہتا ہوں، یہ بک بک بند کرو۔

(مہراں اور زور سے رونے لگتی ہے۔ بچہ بھی روئے جا رہا ہے)

رحمت: (دروازے پر سے) ارے کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو؟

(رحمت اندر آتی ہے)

کیا ہوا ہے؟ اتنا شور کیوں مچا رکھا ہے؟

سراج: چاچی اس عورت کا دماغ خراب ہو گیا ہے کہتی ہے گاڑی واپس کر دو۔

رحمت: کیوں مہراں؟

(مہراں روئے جا رہی ہے)

سراج: عجب قسم کی وہمی ہے۔ کہتی ہے کہیں گاڑی موٹر کے نیچے نہ آ جائے اور گڈو ـــــــ

رحمت: اللہ خیر کرے، ایسی منحوس بات کیوں سوچتی ہو مہراں! ارے بچے کو تو چپ کراؤ۔

(رحمت بچے کو گود میں اٹھا لیتی ہے، اور اسے پچکارنے لگتی ہے)

سراج: ہاں چاچی! تمام انار کلی، مال روڈ پر گھوما ہوں، جب کہیں جا کر یہ ہاتھ آئی ہے۔ اتنی خوبصورت ہے کہ کیا کہوں ذرا دیکھو۔

رحمت: رہنے دو صبح دیکھ لوں گی۔

سراج: ذرا ٹھہرو تو ـــــــ (ایک گوشے میں چلا جاتا ہے جہاں اندھیرا ہے)

مہراں کہاں ہے گاڑی؟

(مہراں خاموش رہتی ہے)

رحمت: (آہستہ سے) خواہ مخواہ کیوں لڑتی ہو ـــ کہاں رکھی ہے، بتا دو نا!

مہراں: وہیں ہو گی، سوئی تو ہے نہیں کہ نظر نہ آئے۔

سراج: یہاں نہیں ہے۔

رحمت: اٹھ کر دیکھونا —— کمال کر دیتی ہو کبھی کبھی خواہ مخواہ کا جھگڑا۔

مہراں: میں کیا بتاؤں، وہیں ہو گی۔

سراج: کہاں ہے آخر؟

(مہراں بیٹھی رہتی ہے، رحمت لالٹین لے کر ادھر جاتی ہے، وہاں صرف خالی بوریاں پڑی ہیں)

رحمت: مہراں ادھر تو نہیں ہے،

مہراں: میں کیا جانوں بوریوں کے اوپر میں نے رکھی تھی۔

سراج: تو نہیں ہے نا یہاں۔

مہراں: ہیں؟

(مہراں اٹھ کر ادھر جاتی ہے)

سراج: کہاں ہے؟

مہراں: (چھاتی پر ہاتھ مار کر) ہائے میرے اللہ! میں نے یہاں لٹکا دیا تھا اسے۔

رحمت: میں کہتی ہوں تم دونوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ رات کا وقت اور دروازے کے دونوں پٹ کھلے۔ کہہ کر گئی تھی بی بی رانی کو کہ رات کو ذرا خبردار رہا کرو، چوری کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ اب بیٹھ کر روؤ نصیبوں کو

سراج: کہیں اور تو نہیں رکھی تھی۔

مہراں: نہیں۔

رحمت: گھر ہے کتنا بڑا، کوئی سوئی تو ہے نہیں تھی۔

سراج: اس منحوس عورت کی مہربانی ہے، کالی زبان والی۔

مہراں: میں نے کیا کیا ہے —— (سسکیاں)

رحمت: تھانے اطلاع تو دو جا کر۔

سراج: میری زندگی تو جہنم بن گئی ہے اس گھر میں۔

(جلدی سے باہر نکل جاتا ہے)

رحمت: دروازہ بند کیوں نہیں کیا تھا۔ لے گیا ہے لیجانے والا مزے سے۔

مہراں: ہائے میرے اللہ! دو دو بجے تک کام کرکے یہ پیسے جمع کیے تھے بچارے نے کتنے شوق سے لایا تھا!

(مہراں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ بچہ بھی رونے لگتا ہے)

(پردہ)

لہو اور قالین

افراد

بابا .... نوکر

تجمل .... ایک سرمایہ دار

اختر .... مصوّر

رؤف .... تجمل کا پرائیویٹ سیکرٹری

منظر

سردار تجمل حسین کی کوٹھی "النشاط" کا ایک وسیع کمرہ، یہ کمرہ اختر سٹوڈیو کے طور پر استعمال کرتا ہے، نہایت اعلیٰ فرنیچر سے آراستہ، فرش پر قالین، دیواروں پر مشہور مصوروں کے شاہکار ایک طرف ریڈیو سیٹ، کچھ فاصلے پر صوفہ سیٹ اور کرسیاں، شمالی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی دونوں الماریوں میں مجلد کتابیں، کارنیس اور تپائیوں کے اوپر تر و تازہ پھولوں سے مزین گلدان، دروازے اور کھڑکیوں پر ریشمی پردے، وسط میں ایزل، ایزل پر کینوس جو ابھی تک سادہ اور صاف ہے۔ قریب ایک تپائی پر رنگوں کے ڈبے چینی کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں، طرح طرح کے قلم اور مصوری کا دوسرا سامان، گرمیوں کے ابتدائی زمانے کی ایک صبح روشندانوں میں سے دھوپ اندر آرہی ہے، جب پردہ اٹھتا ہے تو بابا جھاڑن سے کمرے کی چیزیں صاف کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے دو چار لمحوں کے بعد تجمل آتا ہے، تجمل کی عمر ۴۰ اور ۴۵ کے درمیان ہوگی، صحت نہایت اچھی جسم پر قیمتی سوٹ۔

تجمل: یہ اختر کہاں ہے بابا؟

بابا: ادھر باغ میں ہیں سرکار!

تجمل: ابھی تک باغ میں۔ وہاں کیا کر رہے ہیں؟

بابا: ٹہل رہے ہیں۔ میں نے کہا بھی سرکار ناشتہ تیار ہے اندر آجائیں مگر انہوں نے تو مجھے جھڑک دیا۔ ابھی تک دھوپ میں ٹہل رہے ہیں۔ رات سرکار (خاموش ہو جاتا ہے)

تجمل: رات کیا؟

بابا: میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ ہوا یہ سرکار کہ میری اچانک آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ باغ میں کوئی شخص گھوم رہا ہے۔ سمجھا چور ہے۔ شور مچانے ہی والا تھا کہ اختر میاں کے ہاتھ میں ان کی چھڑی نظر آگئی۔

تجمل: اس قسم کے لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے۔ ہر وقت کسی نہ کسی سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں۔ الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔

بابا: سرکار! میں تو نہ خود یہاں آتا ہوں اور کسی یہاں آنے دیتا ہوں۔ ذرا صفائی کے لئے پانچ دس منٹ کے لئے آجاتا ہوں۔ میں نے کہا سرکار!

تجمل: کیا ہے؟

بابا: شاید کچھ ایسے ویسے ہیں چند روز سے

تجمل: پھر وہی بات ایک بار کہہ جو دیا، تم فن کاروں کو نہیں سمجھ سکتے، یہ ہر وقت یونہی پریشان رہتے ہیں۔

بابا: (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) اچھا سرکار!

تجمل: بلا لاؤ انہیں، جلدی کرو۔

بابا: بہتر!

(بابا کمرے سے نکل جاتا ہے، تجمل آگے بڑھ کر کینوس کو دیکھنے لگتا ہے۔ اختر آتا ہے۔

ادھیڑ عمر کا شخص، سر کے بال بکھرے ہوئے۔ آنکھیں شب بیداری کی وجہ سے سرخ لباس پاجامہ اور قمیص، آستینیں چڑھی ہوئی آنکھوں کے گرد حلقے زیادہ نمایاں)

اختر: (تجمل کی طرف دیکھے بغیر) ہاں!

تجمل: بڑی دیر تک ہٹتے رہے ہو آج۔

اختر: جی ہاں۔

تجمل: ایک بہت بڑی خوشخبری سنانے آیا ہوں تمہیں۔ ابھی ابھی میرے ایک دوست نے فون کیا ہے۔ ججوں نے تمہاری تصویر کو اوّل انعام کا مستحق قرار دیا ہے۔ میں نے تفصیل معلوم کرنے کے لئے رؤف کو بھیج دیا ہے۔ بتائے گا۔

اختر: مجھے اخبار سے معلوم ہو چکا ہے۔

تجمل: (اختر کی بے نیازی پر متعجب) تمہیں اس کا علم تھا اور۔

اختر: اخبار صبح سویرے مل جاتا ہے۔

تجمل: تمہیں یہ خبر سن کر اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیئے تھی، میرا خیال ہے، یہ تمہارا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

(اختر خاموش ہے)

تم نے ملک کے تمام مصوروں کے مقابلے میں یہ انعام جیتا ہے، یہ کوئی معمولی اعزاز نہیں ہے۔ میں نے اس خوشی پر آج شام چائے کا اہتمام کیا ہے۔ تمہیں مبارک باد دینے شہر کے معززین آ رہے ہیں۔ سنا تم نے۔

(اختر خاموش ہے)

کیا کہا؟

اختر: کچھ نہیں۔

تجمل: کچھ نہیں (اختر کے چہرے کو غور سے دیکھ کر) شاید بابا نے غلط نہیں کہا تھا معلوم ہے اس نے کیا کہا تھا؟

اختر: جی نہیں۔

تجمل: اس نے کہا تھا (مسکرا کر) ہمارے مصور کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہے۔ ان دنوں یہ تمہارا

کیا خیال ہے اپنا؟

اختر: صحیح کہا تھا اس نے!

تجمل: یعنی کہ

اختر: یہی کہ یہاں سے رخصت ہو چاہتا ہوں۔

تجمل: کیا کہا؟ (لہجے میں حیرت) رخصت ہونے کی ضرورت؟

اختر: میرا دل چاہتا ہے۔

تجمل: کوئی شکایت؟ کوئی تکلیف؟؟

اختر: کوئی شکایت نہیں۔

تجمل: پھر بات کیا ہے؟ اگر کوئی تکلیف ہے تو صاف کیوں نہیں کہہ دیتے۔ تمہارے لئے اب کیا نہیں کیا گیا۔ اور کیا کچھ نہیں کیا جائے گا؟

اختر: میں اس کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں، پھر بھی۔

تجمل: پھر بھی کا کیا مطلب؟

اختر: مجھے جانا ہی چاہیئے۔

تجمل: بے وقوف نہ بنو اختر۔ بیٹھے بیٹھے آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

اختر: اس کا جواب دے چکا ہوں۔

تجمل: اگر تمہیں کچھ نہیں ہوا تو اس بے وقوفی کی وجہ؟ ذرا سوچو تو۔ یہاں آکر تم نے کتنے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں، کتنی زبردست قدر و منزلت حاصل کی ہے۔ اس سے بڑی عزت کیا ہوگی کہ آج تم ملک کے بہترین مصوّر سمجھے جاتے ہو۔ اور کیا چاہیئے تمہیں؟

اختر: اس کے لئے میں آپ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تجمل: مجھے شکریئے کی ضرورت نہیں۔ صاف صاف بتاؤ تمہیں تکلیف کیا ہے کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اور کیا چاہیئے تمہیں؟

اختر: مجھے کچھ نہیں چاہیئے، رخصت ہونے کی اجازت دیجئے۔

تجمل: اس پاگل پن کی اجازت کیوں کر دے سکتا ہوں؟

اختر: آخر کیوں؟

تجمل: اس کی وجہ تم نہیں جانتے کیا؟

(اختر خاموش رہتا ہے)

سنا ہے آرٹسٹوں پر کبھی کبھی دورے بھی پڑتے ہیں۔ شاید (اختر کی طرف مسکرا کر دیکھتا ہے۔ اختر کا چہرہ بدستور سنجیدہ ہے) کچھ اس قسم کی بات معلوم ہوتی ہے۔

اختر: مجھے مجبور نہ کیجئے۔

تجمل: کیا حماقت ہے ایک شخص کو دلدل سے نکالا جاتا ہے اور جب وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر اسی دلدل میں چھلانگ لگانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

اختر: میرے فن کی بہتری اسی میں ہے کہ یہاں سے چلا جاؤں۔

تجمل: فن کی بات کرتے ہو، یہاں آنے سے پہلے بھی تمہارے پاس فن تھا، اور —— آج بھی ہے مگر دونوں میں کتنا فرق ہے؟ تم خود نہیں جانتے یہ فرق؟

اختر: کیا آپ سمجھتے ہیں میں آپ کا شکر گزار نہیں ہوں!

تجمل: اختر!

اختر: فرمایئے۔

تجمل: اگر تم سنجیدگی سے یہ بات کر رہے ہو۔ تو سن لو۔ میں تمہیں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ میری توہین ہے لوگ کیا کہیں گے؟

اختر: لوگوں کو میرے اور آپ کے ذاتی معاملے سے کیا واسطہ۔

تجمل: تم دنیا سے الگ تھلگ رہ کر مصوری کرتے رہتے ہو، تمہیں معلوم نہیں لوگ اس قسم کے واقعے پر کیا کچھ کہتے ہیں۔ سب کہیں گے ایک غریب اور قلاش مصور کو جھونپڑی میں سے نکال کر لایا دکھاوے کے لئے اور پھر اسے واپس بھیج دیا، کیا یہ میری توہین نہیں ہے؟

اختر: (بھونچکا ہو کر) توہین کیسی؟

تجمل: اتنی موٹی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟

اختر: صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آپ نے مجھے خرید لیا ہے اور اب میں آپ کے رحم وکرم پر ہوں۔

تجمل: یہ بات نہیں ہے اختر (ملائمت سے) غور تو کرو۔ کتنی عجیب حالت ہوگی میری بیں نے فرداً فرداً کئی دوستوں کو چائے کی دعوت دے دی ہے۔ وہ ضرور شام کو آئیں گے۔

اختر: میرے جانے یا نہ جانے سے اس دعوت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟

تجمل: میں سمجھتا ہوں نا فرق پڑتا ہے۔ اب اس پاگل پن کو چھوڑو اور اطمینان کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔

اختر: آپ مجھے اس طرح روک نہیں سکتے۔

تجمل: روک نہیں سکتے۔ خوب، جس شخص کو میں اپنا سمجھ رہا ہوں اس پر مجھے اتنا حق بھی نہیں ہے کہ اسے کسی پاگل پن سے روک سکوں؟ آج تم اتنی بلندیوں پر پہنچ گئے ہو۔ اس لئے جانا چاہتے ہو۔ تمہیں اس بات کا احساس نہیں کہ تمہیں ان بلندیوں تک پہنچانے میں میں نے بھی کچھ حصہ لیا ہے۔

اختر: آپ اصرار کرتے ہیں تو سنیئے۔ جس اختر کو آپ ایک تنگ و تاریک کوٹھری سے نکال کر اپنے محل میں لائے تھے وہ مصور اختر مر چکا ہے اور جو شخص آپ کے سامنے کھڑا ہے اور جس کے لئے یہ شاندار سٹوڈیو بنایا گیا ہے وہ اس کی چلتی پھرتی لاش ہے۔

تجمل: معلوم ہوتا ہے دورہ بہت شدید ہے مجھے ڈاکٹر کو فون کرنا چاہیئے۔

(تجمل جانے لگتا ہے۔ اختر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے)

اختر: (لہجے میں کس قدر تحکم) ٹھہریئے اور سب کچھ سن کر جایئے۔ میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت بیان کر دی ہے۔

تجمل: یہ سب سے بڑی حقیقت ہے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ ڈاکٹر کو کرنا چاہیئے۔

اختر: آپ ابھی تک اسے ایک مذاق سمجھ رہے ہیں، حالانکہ میں بالکل نارمل ہوں ——— آپ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھ رہے ہیں۔ اور اب اس کا دوسرا رخ دیکھئے، جو اتنا

...ناک ہے کہ آپ کے تصورات کا شیش محل ابھی زمین بوس ہو جائے گا، گذشتہ ڈیڑھ برس میں جتنی تصویریں میرے نام کے ساتھ اس شاندار محل سے باہر گئی ہیں، ان میں سے ایک بھی میری نہیں ہے۔

تجمل: (اختر کو گھورتے ہوئے) معاملہ اتنی دور تک جا پہنچے گا مجھے اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا، اختر میرا مشورہ یہ ہے کہ اس وقت آرام کرو۔ تمہیں مکمل آرام کی سخت ضرورت ہے۔

اختر: ذرا تحمل سے کام لیجئے۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے کہنے دیجئے۔

تجمل: تم پاگلوں کی سی باتیں کر رہے ہو تحمل سے کام خاک لوں:

اختر: جب آپ کو پوری حقیقت معلوم ہو جائے گی اس وقت فیصلہ کیجئے کہ یہ پاگل پن ہے یا کچھ اور۔

...: پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے آخر گزشتہ دو سال سے تم میرے مہمان ہو، اس دوران میں تم نے کئی تصویریں بنائی ہیں جو شہر کے معزز لوگوں کی کوٹھیوں میں آویزاں ہیں ان میں سے اکثر میں نے تحفتہً اپنے دوستوں کو دی ہیں یہ سب کی سب تمہاری ہیں۔ تمہاری اپنی تخلیق ہیں۔ لیکن آج تم کہہ رہے ہو، ان میں سے ایک بھی میری نہیں ہے۔ کوئی اور سنے گا تو کیا کہے گا؟

اختر: مجھے اس کی پروا نہیں کہ کوئی اور سنے گا تو کیا کہے گا۔ میرے لئے یہ کشمکش ناقابلِ برداشت ہو چکی ہے۔ اس خلش نے مجھے بے قرار کر دیا ہے۔ یہ فریب اب زندہ نہیں رہ سکتا۔

تجمل: فریب! آج تمہیں کیا ہو گیا ہے اختر۔ کاش میں کچھ سمجھ سکتا کہ تمہاری اس پریشانی کی وجہ کیا ہے ڈاکٹر کو تم بلانے نہیں دیتے۔ میں کیا سمجھوں آخر؟

اختر: آپ سب کچھ سمجھ جائیں گے، یہ کوئی معما نہیں ہے۔ سنیئے جیسا کہ آپ جانتے ہیں آج سے دو سال پہلے میں ایک تنگ و تاریک گلی کے ایک خستہ اور بدنما مکان میں رہتا تھا۔ بہت کم لوگ مجھے جانتے تھے اور جو جانتے تھے انہیں میرے متعلق

صرف یہی معلوم تھا کہ میں ایک مفلس، قلاش اور گمنام مصور ہوں، میں نے بے شمار تصویریں بنائی تھیں، مگر وہ تمام کی تمام کباڑیوں یا نیلام گھروں میں پہنچ کر کوڑیوں کے بھاؤ بک چکی تھیں، زندگی اسی حالت میں گزر رہی تھی کہ اتفاقاً تصویروں کی ایک نمائش گاہ میں میری آپ سے ملاقات ہو گئی آپ نے میری تصویروں میں دل چسپی لی اور مجھے اسی شام کو اپنے ہاں چائے پر بلا لیا۔ میں اپنے ہزاروں ہم پیشہ بھائیوں کی طرح غربت کی چکی میں پس رہا تھا، یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو چھپی رہ سکتی۔ آپ نے میری حالت کا اندازہ لگا لیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ میں اپنے غربت کدے سے نکل کر آپ کے ہاں آ جاؤں تاکہ اطمینان کے ساتھ فن کی خدمت کر سکوں۔ آپ نے میرے لئے یہ کمرہ وقف کر دیا اور مجھے زندگی کی ضروریات سے بے نیاز کر دیا۔

تجمل: ان باتوں کے ذکر کی کیا ضرورت ہے؟

اختر: میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ کے سلوک نے مجھ پر کیا اثر ڈالا۔ میں سمجھنے لگا، آپ نہایت اونچے درجے کے انسان ہیں۔ دولت مند ہونے کے باوجود آپ کے پہلو میں ایک ایسا دل دھڑک رہا ہے جو انسانیت نواز ہے جس میں ساری دنیا کا درد سمایا ہوا ہے۔ آپ نے اپنے دوستوں کو بلا کر انہیں میری تصویریں دکھائیں آپ نے بڑے بڑے اداروں کے دفتروں میں میری تصویریں آویزاں کرائیں آپ نے میری شہرت کے لئے میری تخلیقات رسائل و جرائد میں چھپوائیں۔ سچ مچ اس وقت آپ میری نظروں میں ایک دیوتا تھے۔ ایک فرشتہ تھے۔ ایک ایسی ہستی تھے جس کی تعریف ہمارے قصوں اور کہانیوں میں کی گئی ہے۔

تجمل: میں نہیں سمجھ سکتا، اس ذکر سے تمہارا مقصد کیا ہے؟

اختر: مگر تھوڑے عرصے بعد ہی ایک بھیانک خیال اپنا منحوس سایہ میرے ذہن میں ڈالنے لگا مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں نے آپ کی ذات کے بارے میں جو کچھ سوچا ہے وہ محض میری اپنی خوش فہمی ہے حقیقت کچھ اور ہے۔

تجمل: کیا مطلب ؟

اختر: مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ آپ کی سر پرستی تو محض ایک اشتہار ہے آپ کی مصور نواز شخصیت کا اور اس سر پرستی میں آپ کا ایک خاص مقصد چھپا ہوا ہے۔

تجمل: کیا کہہ رہے ہو تم ؟

اختر: آپ مجھے نواز رہے تھے مگر ایک خاص مقصد کی خاطر اور وہ مقصد یہ تھا کہ آپ سوسائٹی کو بتانا چاہتے تھے دیکھو میں کتنا اچھا ہوں، میں نے ایک غریب اور مفلس مصور کو اپنے ہاں پناہ دی ہے اب یہ جو کچھ بنا رہا ہے محض میری سر پرستی کا نتیجہ ہے۔ میں نے اس کی صلاحیتوں کو زندہ رکھا ہے ورنہ یہ کب کی ختم ہو چکی ہوتیں، جس طرح بڑی بڑی دکانوں کے دروازوں پر انسانی پیکروں کو نہایت خوب صورت اور شفاف لباس پہنا کر انہیں الماریوں کے اندر سجا دیا جاتا ہے تاکہ لوگ ان حسین وجمیل مجسموں کو دیکھ کر دکانداروں کے اعلیٰ ذوق اور ان کی شان وشوکت سے مرعوب ہو جائیں۔ اسی طرح آپ بھی اپنی امارت اور اپنی شخصیت کی نمائش کے لئے میری ذات اور میرے فن کو استعمال کر رہے تھے۔

تجمل: (غصے سے) یہ جھوٹ ہے ــ سراسر جھوٹ ہے۔

اختر: او- آپ کہہ بھی کیا سکتے ہیں۔ مگر بلند آواز سے حقیقت نہیں بدل سکتی آپ کے یہاں میری یہی حیثیت تھی۔ اور جس وقت مجھے اس کا احساس ہوا مجھے محسوس ہوا جیسے میری اہلیتوں پر زنگ کی تہہ جم گئی ہے۔ میرے سینے میں ایک بھی شرارہ باقی نہیں رہا، یہ احساس میرے لئے سوہانِ روح ثابت ہو رہا تھا کہ اپنے جگر کا خون دے دے کر میں نے فن کی جس شمع کو اب تک روشن رکھا ہے۔ اس کا مقصد آپ کی شاندار کوٹھی اور آپ کی شخصیت کو جگمگانے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں، ایک فنکار یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ کہ اس کا فن اپنا اصلی جوہر کھو کر کسی کے لئے محض ایک ذریعۂ شہرت بن کر رہ جائے۔ انہی دنوں مجھے ایک ہم پیشہ دوست مل گیا جو بدستور غربت کی چکی میں پس رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی ذہنی کیفیت بتائی اور التجاء کی کہ وہ مجھے اپنے ہاں رہنے کی جگہ دے دے۔ یہ سن

کہ اس نے کہا، دیکھو اگر تم آج کل تصویریں نہیں بنا سکتے تو کوئی حرج کی بات نہیں تمہارے لئے میں تصویریں بناتا رہوں گا۔ تم مجھے اتنے پیسے دے دیا کرو کہ میں اور میرا خاندان عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہ سکے۔ یہ تجویز میرے لئے ناقابل برداشت تھی، مگر اس کا اصرار کم نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح وہ کھیل شروع ہو گیا جو دنیا کا سب سے گندہ اور ذلیل کھیل ہے۔ مجھے یہاں روپے حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی یہ روپے میں اسے دے دیتا تھا اور وہ مجھے اپنی تصویریں۔

تجمل: ان تصویروں کو تم۔

اختر: اپنی تخلیق بنا کر پیش کر دیتا تھا۔

(تجمل اس انداز سے اختر کو دیکھتا ہے جیسے ان الفاظ سے اسے دھچکا سا لگا ہو)

تجمل: تم مجھے دھوکہ دیتے رہے اب تک۔

اختر: دھوکہ یا کچھ اور۔ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ نیازی کو وقتاً فوقتاً سکے ملتے رہے۔ مجھے بنی بنائی تصویریں اور آپ کو فن کی قدر افزائی اور مصور نوازی کے لئے سوسائٹی میں عزت و احترام ——

تجمل: میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی پست سطح پر اتر چکے ہو۔

اختر: میں نے خود کبھی نہیں سوچا تھا لیکن اس پست سطح پر اترنے کے لئے مجبور تھا۔ نیازی نے مجھے کئی تصویریں دی ہیں۔ یہ تصویریں آج آپ جیسے معزز لوگوں کے ڈرائنگ روموں کی زینت ہیں۔ وہ پہلے کی طرح مفلس نہیں ہے وہ اپنی بہن کی شادی کر چکا ہے۔ اسے روٹی اور کپڑے کی بھی تکلیف نہیں۔ اب مالک مکان بھی اسے پریشان نہیں کرتا مگر میں جانتا ہوں اس کے دل کی کیا کیفیت ہے۔ اپنی اولاد کو چند سکوں کے عوض دوسروں کو سونپ دینا ایک ایسا تکلیف دہ واقعہ ہے جس کا اندازہ آپ نہیں لگا سکتے۔ آج جب اس نے سنا ہو گا کہ اس کی بنائی ہوئی تصویر اول انعام کی مستحق قرار پائی ہے تو اس کی کیا

حالت ہوئی ہوگی وہ کیا سوچے گا، اسے کتنا دکھ ہوگا۔ میں اس تصور سے کانپ جاتا ہوں۔

تجمل: تو اب تک تم نے ہمیں دھوکے میں رکھا۔ اپنی نالائقی چھپاتے رہے۔ میں نے اتنی آسائشیں بے کار مہیا کی تھیں۔

اختر: آپ ان کی قیمت وصول کر چکے ہیں ہمیشہ کی طرح اس سودے میں آپ ہی کو فائدہ ہوا ہے۔

تجمل: اس قدر فریب دینے کے بعد اپنے محسن کو جلی کٹی سناتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟

اختر: مجھے شرم کیوں آئے گی۔ شرم تو آپ لوگوں کو آنی چاہیے جو بلندیوں پر پہنچنے کے لئے ہزاروں انسانوں کو اپنی سیڑھی بنا لیتے ہیں۔ ایک فن کار کی سرپرستی بھی کرتے ہیں۔ تو اپنے مطلب کے لئے۔

تجمل: اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ تم کیا ہو، احسان فراموش، چور، مجرم۔

اختر: میں سب کچھ ہوں مگر تم۔ تم کیا ہو۔ یہ بھی تو کہو؟

تجمل: میں؟

اختر: ہاں تم — بتاؤ، خاموش کیوں ہو۔ بتاتے کیوں نہیں۔ دوسروں کے جرم دیکھ لیتے ہو۔ دوسروں کو مجرم کہتے ہو، مگر اپنے متعلق کچھ نہیں کہتے۔ بتاؤں کون ہو تم؟

(رؤف آتا ہے۔ دونوں خاموش ہو جاتے ہیں)

رؤف: وہ خبر بالکل درست ہے جناب۔ پہلا انعام اختر صاحب ہی کو ملا ہے۔ یہ رہا اخبار (بغل سے اخبار نکالتا ہے) آپ ......

.... (دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے)

تجمل: تم جاؤ اس وقت۔

رؤف: بہتر جناب! (رؤف دروازے کی طرف جانے لگتا ہے، پھر ٹھہر جاتا ہے۔) اوہ یاد آگیا۔ مسٹر اختر آپ کا کوئی واقف کار راستے میں ملا تھا۔ اس نے ایک پیغام دیا ہے آپ کے نام۔ آپ کا کوئی مصور دوست تھا نیازی۔

اختر: ہاں کیا ہوا اسے، جلدی بتاؤ؟

رؤف: افسوس آج صبح اس نے خودکشی کر لی۔

اختر: خودکشی!

رؤف: جی ہاں۔ ہسپتال جانے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔

اختر: (تجمل سے) سنا تم نے ابھی پوچھ رہے تھے۔ میں کیا ہوں، اب تو تمہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ تم کیا ہو۔ تم قاتل ہو۔ یہ قتل تم نے کیا ہے؟

تجمل: (غصے سے گرج کر) بکواس بند کرو۔

اختر: قانون تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ مگر انسانیت کی نظروں میں تم قاتل ہو، تم نے دو قتل کئے ہیں۔ ایک مصور کے فن کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور دوسرے مصور کی جان لی ہے۔ یہ قتل نہیں تو اور کیا ہے۔ اور قتل کیا ہوتا ہے؟

تجمل: نکل جاؤ یہاں سے کمینے پاجی، احسان فراموش!

اختر: میری زبان رک نہیں سکتی۔ میں چیخ چیخ کر کہوں گا، دیکھو لوگو! یہ قاتل ہے، اس کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے ہیں۔ یہ سوسائٹی کا خوفناک مجرم ہے یہ ——

تجمل: رؤف کھڑے کیوں ہو۔ اس پاجی کو دھکے دے دے کر نکال دو۔ لے جاؤ اسے پاگل خانے میں۔ پولیس کو ٹیلی فون کرو۔ یہ پاگل ہو گیا ہے۔ خطرناک پاگل ہے۔

(رؤف اختر کو دھکے دے کر باہر نکالنے لگتا ہے۔ اختر چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے۔ "تم قاتل ہو۔ تم نے قتل کیا ہے۔ میں خاموش نہیں رہوں گا۔" یہ آواز آہستہ آہستہ ڈوبنے لگتی ہے۔ تجمل دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پیشانی کا پسینہ پونچھتا ہے۔

پردہ گرتا ہے)

بیٹا

کردار

(جس ترتیب سے سٹیج پر آتے ہیں)

زینت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شبیر کی بیگم

ایاز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زینت کا لڑکا

ثریا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایاز کی بہن

فضلاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نوکرانی

شبیر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زینت کا شوہر

ایک عورت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

منظر

شبیر کا ڈرائنگ روم، اچھا خاصا سجا سجایا، فرش پر قالین خوب صورت اور بیش قیمت ۔ ایک طرف ایک دوسرے کے بالمقابل دو صوفہ سیٹ، ان کے علاوہ کرسیاں، تپائیاں اور بک شیلف دروازے دو ایک مغربی دیوار میں جو دوسرے کمرے میں کھلتا ہے اور دوسرا جنوبی دیوار میں جس کے آگے صحن ہے۔

سامنے کی دیوار میں کلارک جو شام کے چھ بجنے کا اعلان کر رہا ہے۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو ہم بلب کی روشنی میں زینت کو دیکھتے ہیں جو ایک چادر میں لپٹی لپٹائی، صوفے میں دھنسی ہوئی سویٹر بننے میں مشغول ہے۔

زینب تیس بتیس برس کی ایک قبول صورت عورت ہے۔ پیشانی چوڑی اور خدوخال گہرے گہرے، چہرہ دیکھنے سے پہلا تاثر جو ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ عورت بڑی معاملہ فہم اور زیرک ہے اور زندگی کو سنجیدگی کے ساتھ بسر کرنے کی قائل ہے۔ صوفوں کے سامنے زینت کے دونوں بچے کھیل رہے ہیں۔ ایاز قالین پر موٹر چلا رہا ہے اور ثریا بڑی دل چسپی سے یہ تماشا دیکھ رہی ہے۔ ایاز کی عمر سات برس

کے لگ بھگ ہے اور ثریا اس سے ایک سال چھوٹی نظر آتی ہے۔
زینت سویٹر سے نظر ہٹا کر کلاک کو دیکھتی ہے۔ پھر یکایک اس کی نگاہ صوفے کے بازو پر رکھی ہوئی ایک کتاب پر جا پڑتی ہے وہ سلائیاں ایک طرف رکھ دیتی ہے۔ کتاب اٹھاتی ہے، اس میں سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکالتی ہے۔ اور اسے دیکھنے لگتی ہے۔ ثریا ایاز سے موٹر لینے کی کوشش کرتی ہے مگر وہ نہیں دیتا۔ ثریا رونے لگتی ہے۔ زینت کاغذ ہاتھ میں لئے بچوں کی طرف دیکھتی ہے۔)

زینت: ایاز! یہ کیا ہو رہا ہے۔ اتنا شور!

ایاز: امی! میں کہاں شور مچا رہا ہوں۔ شور تو ثریا مچا رہی ہے۔

ثریا: امی!

زینت: کیا ہے؟

ثریا: بھائی جان موٹر نہیں دیتا۔

زینت: ابا جان آنے والے ہیں اب تم لوگ تمیز کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ سکول کا کام نہیں کرنا؟ جاؤ پڑھو اپنے کمرے میں جا کر۔

ثریا: امی!

زینت: اب کیا ہے؟

ثریا: میں اپنا سبق یاد کروں گی۔

زینت: شاباش، بڑی اچھی بچی ہو۔ اب جاؤ۔

(ایاز اور ثریا دونوں مغربی دروازے میں سے نکل جاتے ہیں زینت اٹھ کر دروازے تک جاتی ہے اور پھر واپس اپنی جگہ پر بیٹھ کر وہی کاغذ دیکھنے لگتی ہے۔ سر جھکا کر کچھ سوچتی ہے۔ جنوبی دروازے سے فضلاں آتی ہے)

فضلاں: بی بی۔

زینت : ہوں!

فضلاں : ایک لڑکا!

زینت : پوری بات کرو نا۔ ایک لڑکا کیا ہوا؟

فضلاں : صاحب کا نام لے کر پوچھ رہا ہے۔

زینت : کہتا ہے شبیر صاحب سے ملنا ہے؟

فضلاں : جی!

زینت : تو —— ہاں لے آؤ، صاحب آہی رہے ہوں گے۔

(فضلاں چلی جاتی ہے۔ زینت جنوبی دروازے کی طرف دیکھتی ہوئی کاغذ تہ کر کے کتاب میں رکھ دیتی ہے چار پانچ لمحوں کے بعد فضلاں کے ساتھ ایک لڑکا آتا ہے۔ نحیف و نزار جسم، عمر نو برس کے قریب، اچکن پہنے ہوئے جو کافی پرانی معلوم ہوتی ہے زینت کتاب صوفے میں رکھ دیتی ہے —— آنکھ اٹھا کر لڑکے کی طرف دیکھتی ہے۔ لڑکا ڈرا ڈرا، سہما سہما۔۔۔۔۔۔ آگے بڑھتا ہے۔ فضلاں واپس چلی جاتی ہے۔)

لڑکا : جی —— شبیر صاحب!

زینت : آؤ —— یہاں آکر بیٹھ جاؤ۔

لڑکا : شبیر صاحب سے ملنا ہے۔

زینت : بھئی آؤ بیٹھ جاؤ۔ ابھی آئے نہیں وہ۔ آہی رہے ہوں گے۔

(لڑکا آگے بڑھ کر کرسی میں بیٹھ جاتا ہے)

نہیں وہاں نہیں بھائی۔ یہاں آؤ (اپنے قریب کے صوفے کی طرف اشارہ کر کے) اتنی دور کیوں جا بیٹھے ہو؟

(لڑکا اٹھ کر زینت کے پاس —— صوفے پر بیٹھ جاتا ہے)

بس ٹھیک ہے۔ اب بتاؤ کہاں سے آئے ہو؟

لڑکا: میں — وہاں سے۔

زینت: وہاں سے؟ — وہاں سے کہاں سے؟

(زینت لڑکے کی طرف غور سے دیکھتی ہے)

لڑکا: شبیر صاحب کا یہی گھر ہے نا؟

زینت: کہہ تو رہی ہوں شبیر صاحب آنے ہی والے ہیں۔ تم جھجکتے کیوں ہو؟

لڑکا: جی نہیں۔

زینت: تو پھر بتاتے کیوں نہیں کہاں سے آئے ہو؟

لڑکا: جی — پشاور سے۔

زینت: ہیں؟ پشاور سے؟ اکیلے؟ کوئی ساتھ بھی ہے؟

لڑکا: اکیلا آیا ہوں۔

زینت: یہ مصیبت کیا پڑی! کس نے بھیجا ہے تمہیں؟

لڑکا: خود آیا ہوں — تنہا

زینت: تنہا کیوں آئے ہو — قصہ کیا ہے؟

(غور سے لڑکے کو دیکھتی ہے۔ لڑکا پریشان ہو جاتا ہے)

گھبراؤ نہیں بیٹا! فکر کی کیا بات ہے۔

لڑکا: وہ کب آئیں گے؟

زینت: عام طور پر روزانہ پانچ بجے تک آجاتے ہیں۔ آج کچھ دیر ہو گئی ہے۔

تمہارا نام کیا ہے بیٹا؟

لڑکا: سلیم!

زینت: سلیم بیٹا! اتنی سردی میں پشاور سے تنہا آنے کی کیا ضرورت تھی؟

لڑکا: کچھ نہیں — وہ

زینت : کہونا ــــــ کیا بات ہے ۔

(لڑکا خاموش رہتا ہے)

خاموش کیوں ہو گئے ؟

لڑکا : شبیر چچا آ جائیں گے ابھی ؟

زینت : (مسکرا کر) ہاں تمہارے شبیر چچا آ ہی رہے ہوں گے ۔ بھوک لگی ہوگی ۔ راستے میں کیا کھایا ہوگا بھلا (جنوبی دروازے کی طرف منہ کر کے) فضلاں !

(فضلاں آتی ہے)

دیکھو فضلاں ! پلیٹ میں کچھ پیسٹری لے آؤ ۔ جلدی کرو ۔

فضلاں : اچھا بی بی !

زینت : سلیم بیٹا ! کھانا ہم ذرا دیر سے کھایا کرتے ہیں ــــــ بسکٹ وغیرہ کھا لو ۔ کچھ سہارا مل جائے گا ۔

(لڑکا سر جھکائے خاموش رہتا ہے ۔ فضلاں پلیٹ میں پیسٹری لے کر آتی ہے ۔ تپائی کھینچ کر صوفے کے ساتھ لگا دیتی ہے اور اس پر پلیٹ رکھ کر چلی جاتی ہے)

لو کھا لو ــــــ ارے تم تو بڑے شرمیلے ہو ۔ بھئی کمال ہے ۔

(زینت پیسٹری کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اس کے منہ کی طرف لے جاتی ہے ۔ لڑکا ٹکڑا لے لیتا ہے)

اچھا تو تم تنہا آ گئے گاڑی میں بیٹھ کر بڑے بہادر ہو بھئی ، راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ۔

لڑکا : جی نہیں !

(ٹکڑا کھانے لگتا ہے)

زینت : تم نے بتایا نہیں ۔ تنہا پشاور سے آنے کی ضرورت کیا تھی ۔

لڑکا: انہوں نے مجھے ہوسٹل میں داخل کرا دیا تھا۔

زینت: انہوں نے ــــــ کون ہیں وہ؟

لڑکا: ابا!

زینت: تمہارے ابا جان کا نام کیا ہے؟

لڑکا: جمیل!

زینت: اور کھاؤ نا۔ اچھا تو تمہارے ابا نے تمہیں ہوسٹل میں داخل کرا دیا اور تم (مسکرا کر) بھاگ کر یہاں چلے آئے۔ یہ بات اچھی نہیں کی تم نے۔ ہاں۔ کیا بتایا تھا تم نے اپنا نام؟

لڑکا: سلیم!

زینت: وہاں دل نہیں لگا تھا یا کیا بات تھی؟

(لڑکا خاموش رہتا ہے)

شاید بعض بچوں کا دل ہوسٹل میں نہیں لگتا، اس لئے وہ واپس گھر چلے جاتے ہیں۔ تمہارا دل ہوسٹل میں نہیں لگا تھا۔ تو گھر چلے جاتے۔ یہاں کیوں چلے آئے؟

لڑکا: ابا اور امی مارتے تھے۔

زینت: کیوں؟

(لڑکا خاموش رہتا ہے)

امی بھی مارتی تھی۔

لڑکا: ہاں ــــــ میری ماں نہیں ہے۔

زینت: اب سمجھی۔ یہ تمہاری نئی امی ہوگی۔

(لڑکا اثبات میں سر ہلاتا ہے)

تمہاری اپنی ماں ــــــ

لڑکا: مر گئی تھیں۔

زینت : کب ؟

لڑکا : جب میں بڑا چھوٹا تھا۔ بچہ

زینت : پھر تم کو پالا پوسا کس نے۔ نئی امی نے ؟

لڑکا : نہیں !

زینت : اباجان نے ؟

لڑکا : (ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد) نوکرانی نے

زینت : تمہارے ابا نے اب شادی کی ہے ؟

لڑکا : ہاں !

زینت : امی تو خیر سوتیلی ہوئی مگر ابا ۔ ؟

لڑکا : ابا ۔۔۔ (کچھ نہیں کہہ سکتا)

زینت : ابا بھی پیار نہیں کرتے اب ؟

لڑکا : انہوں نے کبھی ۔۔۔ (سر جھکا لیتا ہے)

زینت : کبھی پیار نہیں کیا ۔۔۔ ؟

لڑکا : وہ ۔۔۔ مجھے اچھا نہیں سمجھتے۔

زینت : تمہیں یاد ہوگا ۔۔۔ پیدا کہاں ہوئے تھے ؟

لڑکا : کلکتے میں۔

زینت : (چونک کر) کلکتے میں ؟ اچھا ۔۔۔ تو پھر یہ خط تمہاری ماں کا ہوگا۔

(جلدی سے کاغذ کتاب میں سے نکالتی ہے۔ لڑکا پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگتا ہے۔ زینت کاغذ کو تہ کر کے کتاب میں رکھ دیتی ہے اور کتاب کو ٹوکری میں جس میں اون کے گچھے پڑے ہیں۔ ڈال دیتی ہے۔)

تمہارے ابا پھر تمہیں کلکتے سے پشاور لے آئے ؟

لڑکا: کبھی کہیں، کبھی کہیں۔

زینت: تمہارے ابا کام کیا کرتے ہیں؟

لڑکا: ریس میں گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ اور کچھ نہیں کرتے۔

زینت: تمہاری نئی امی تمہیں پیار نہیں کرتی؟

لڑکا: کہتی تھیں۔ (لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں)

زینت: ہائے تم رونے کیوں لگے؟

لڑکا: کہتی تھیں تم جمیل کے بیٹے نہیں ہو۔ ایک یتیم بچے ہو جسے جمیل صاحب پال رہے ہیں۔

زینت: یہ کہتی ہے وہ چڑیل کہیں کی۔

لڑکا: اور ابا۔

(آستینوں سے آنسو پونچھتا ہے)

زینت: ابا ڈانٹتے تھے؟

لڑکا: نہیں ——— وہ بھی یہی بات کہتے تھے۔

زینت: ابا بھی یہی بات کہتے تھے ——— یہ کیا کہہ رہے ہو؟

(لڑکے کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے ہیں قمیص کے دامن سے ناک اور آنکھیں صاف کرتا ہے)

اچھا ابا نے تمہیں ہوسٹل میں داخل کرا دیا۔ وہاں تمہارا جی نہ لگا۔ مگر بیٹا! ایک بات بتاؤ۔ تم ہوسٹل سے بھاگ کر یہاں کیوں آئے؟

لڑکا: وہاں لڑکے مجھے چھیڑتے تھے ——— اور ——— مجھے ڈر آتا تھا وہاں۔

زینت: یہ ٹھیک ہے ——— مگر تم یہاں کیوں آئے؟

لڑکا: شبیر چچا مجھے ابا کے سارے دوستوں میں سے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ مجھے کبھی کبھی روپے بھی دیتے ہیں۔

زینت: تمہیں ان کا پتہ کیسے معلوم ہو گیا؟

لڑکا: ابا جو خط لکھتے مجھے وہ میں پوسٹ کیا کرتا تھا ——— مجھے پتہ زبانی
یاد ہو گیا تھا۔

زینت: تمہیں اپنے امی کا نام یاد ہو گا۔

لڑکا: نہیں۔

زینت: تو تم ہمارے ہاں رہنا پسند کرو گے؟

لڑکا: (خوف زدہ لہجے میں) پتہ نہیں۔

زینت: یہاں اور بچے بھی ہیں جن سے مل کر تمہیں بڑی خوشی ہو گی۔ بڑے اچھے بچے ہیں۔
تمہاری طرح رلپیٹ دیکھ کر) اوہ تم نے کچھ کھایا ہی نہیں۔ کھاؤ۔ میں انہیں بلا کر لاتی
ہوں)۔

(زینت مغربی دروازے میں سے نکل جاتی ہے۔ لڑکا اسے
جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ جب وہ چلی جاتی ہے تو جلدی سے
پیسٹری کے دو ٹکڑے منہ میں ڈال لیتا ہے اور پھر تیسرا ٹکڑا
بھی ڈال کر جلدی جلدی نگلنے کی کوشش کرتا ہے ثریا اور ایاز بھاگتے
ہوئے آتے ہیں)

ایاز: آہا۔ یہ ہے امی؟

ثریا: امی!

زینت: ہوں!

ثریا: یہ ہے ——— وہ؟

زینت: اور کون ہو گا؟

ایاز: (سلیم سے) ہمارے ساتھ کھیلو گے۔ ہیں!

(لڑکا کوئی جواب نہیں دیتا)

زینت: کھیلے گا ——— کیوں نہیں کھیلے گا۔

ثریا: ہمارے پاس بہت سے کھلونے ہیں۔

زینت: تو لے جاؤ اسے اپنے ساتھ۔ اور دیکھو جب تک میں نہ بلاؤں ادھر ہرگز نہ آنا۔ سن لیا نا؟

ایاز: اچھا امی جان!

(ایاز سلیم کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ تینوں جانے لگتے ہیں، زینت دروازے تک ان کے ساتھ جاتی ہے، ان کے جانے کے بعد دروازہ بند کر دیتی ہے اور آکر کوچ میں بیٹھ جاتی ہے۔ سلائیاں اٹھاتی ہے مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اب اندرونی ہیجان کی وجہ سے کام نہیں کر سکتی۔ سلائیاں ہاتھ سے رکھ دیتی ہے۔ جنوبی دروازے تک جاتی ہے اور فضلاں کو آواز دیتی ہے)

فضلاں: (باہر سے) جی!

زینت: ابھی آئے نہیں ثریا کے ابا؟

فضلاں: جی نہیں۔

(زینت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی صوفے کی طرف آنے لگتی ہے — کلاک سات کا اعلان کرتا ہے۔ زینت کلاک کی طرف دیکھتی ہوئی صوفے میں اپنے آپ کو گرا دیتی ہے فضلاں دروازے پر آتی ہے)

زینت: کیا ہے فضلاں؟

فضلاں: آ گئے ہیں۔

زینت: آ گئے — اچھا، کھانا تیار نہیں ہوا ابھی؟

فضلاں: جی نہیں۔

(فضلاں چلی جاتی ہے شبیر آتا ہے۔ عمر تیس سال سے کچھ اوپر

اچھی صحت، فرنچ کٹ داڑھی، لمبی لمبی مونچھیں)

شبیر: (مسکراکر) کہو بھئی کیا ہو رہا ہے؟

زینت: بڑی دیر لگادی آج تو آپ نے۔

شبیر: ایک دوست کے ہاں چلا گیا تھا۔ گپ شپ میں وقت گزر گیا۔ بچے کہاں ہیں؟

(شبیر جیسٹر اتارنے لگتا ہے۔ زینت اس کی مدد کرتی ہے جیسٹر لے لیتی ہے اور کرسی کے بازو پر رکھ دیتی ہے)

زینت: ادھر بھیجا ہے۔ انہیں۔ بڑا شور کر رہے تھے۔

شبیر: کوئی تازہ بتازہ خبر۔

زینت: کوئی خاص خبر تو نہیں۔

شبیر: کوئی خاص خبر نہیں۔ یعنی ان سات آٹھ گھنٹوں میں کچھ بھی نہیں ہوا۔ (مسکراکر) کوئی قیامت نہیں ٹوٹی۔ کوئی زلزلہ نہیں آیا۔

زینت: زلزلہ آیا تو نہیں شاید آجائے۔

شبیر: کیا مطلب؟

زینت: بیٹھئے تو سہی پہلے۔

(شبیر کرسی میں بیٹھ جاتا ہے۔ زینت صوفے میں دھنس جاتی ہے)

شبیر: (لہجے میں ذرا گھبراہٹ) کیا ہوا؟

زینت: ایک چیز آئی ہے۔

شبیر: گھبراکر خط کوئی؟

زینت: ہائے اللہ آپ تو خواہ مخواہ گھبرا گئے۔ کہہ رہی ہوں ایک چیز آئی ہے۔ میرے ذہن میں —— افسانہ سمجھ لو۔ افسانہ بھی نہیں صرف پلاٹ، افسانہ بنانے کے لئے تو بہت کچھ سوچنا پڑے گا۔ واقعات کی ترتیب وغیرہ بڑا محنت طلب کام ہے۔

شبیر: (بے نیازی سے) ہاں!

زینت: سنیئے گا۔ پہلی کوشش ہے۔ مذاق تو نہ اڑائیے گا۔

شبیر: کہو تو سہی۔

زینت: سوچا یوں ہے کہ کلکتے کی سرزمین میں ایک لڑکی رہتی تھی جس کا دنیا میں کوئی سہارا نہیں تھا ——— نہ والدین اور نہ کوئی عزیز وغیرہ۔

(شبیر کنکھیوں سے اسے دیکھتا ہے اور رومال نکال کر چہرہ صاف کرنے لگتا ہے۔ زینت خاموش ہو جاتی ہے)

شبیر: پھر؟

زینت: آپ دلچسپی نہیں لے رہے ——— سناؤں کیا خاک؟

شبیر: کیسے معلوم ہوا میں دلچسپی نہیں لے رہا؟

زینت: رومال نکال کر منہ جو پونچھنے لگے ——— خیر آگے سنیئے!

شبیر: ہٹاؤ اس قصے وصے کو۔ کوئی کام کی بات کرو۔

زینت: ذرا سن تو لیجئے، بس مختصر سا ہے۔ ہوا یوں کہ اس بے آسرا لڑکی کا بیاہ ایک شخص سے ہو گیا۔ کچھ مدت کے بعد بچہ ہوا اور وہ ظالم شخص ان دونوں کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا اور اس وقت واپس آیا جب عورت اس کا انتظار کر کے مایوس ہو چکی تھی اور اس کی زندگی میں چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا ——— وہ بے چاری مر گئی ——— ظالم مرد نے بچے کی پرورش کے لئے ایک آیا رکھ لی۔

(شبیر رومال سے پیشانی کا پسینہ پونچھنے لگتا ہے)

ارے آپ تو پسینہ پونچھنے لگے ——— وہ کیا مصرع ہے؟

پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

شبیر: ہٹاؤ اس پلاٹ ولاٹ کو ——— سر بسر بکواس ہے۔

زینت: بکواس تو ہے ہی۔ (مسکرا کر) مگر سارا قصہ تو سن لیجئے۔ اب کہانی کا دوسرا

حصہ شروع ہوتا ہے۔

شبیر: مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ——— کیا انٹ شنٹ سوچتی رہی ہو۔ کھانا تیار ہو گیا ہے یا نہیں؟

زینت: کھانا تیار ہو رہا ہے ——— رشک آتا ہے مجھے خیال تھا آپ ہمت افزائی کریں گے مگر ——— خیر سن لو لیجئے، کچھ مدت کے بعد وہ بچے کو لے کر کہیں اور چلا گیا۔ بچہ پرورش پاتا رہا۔ اب سب سے بڑا ظلم رونما ہوتا ہے۔ مرد دوسری شادی کرتے وقت مشہور کر دیتا ہے کہ یہ بچہ اس کا نہیں ——— بلکہ ایک یتیم بچہ ہے جس کی وہ پرورش کر رہا ہے۔ لڑکے کی نئی ماں لڑکے کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکا کڑھنے لگتا ہے اور ——— (مسکرا کر) افسانہ یہیں تک پہنچا ہے۔ آگے سوچنا پڑے گا۔ کیوں آپ کو پسند آیا۔ آگے کیا ہونا چاہیئے؟ آپ یقیناً مشورہ دیں گے۔

شبیر: میں کوئی مشورہ وشورہ نہیں دے سکتا۔

زینت: مگر سوچئے تو ——— آپ کے سوا اور کون مشورہ دے سکتا ہے؟

شبیر: میں کہتا ہوں ——— یہ سب کچھ فضول ہے، بکواس ہے۔

زینت: میں یہی دیکھنا چاہتی تھی۔

شبیر: کیا مطلب؟

زینت: آپ اس کہانی کے ہیرو کو جانتے ہیں اور اس کا نام ہے۔

(شبیر صوفے سے اٹھ بیٹھتا ہے)

بتا دوں اس کا نام بھی۔ آپ کو ساری کہانی معلوم ہے۔ خیر اس کا نام جمیل ہے اور وہ پشاور میں رہتا ہے۔ آپ کا دوست ہے۔

(شبیر سر پر جلدی جلدی ہاتھ پھیرنے لگتا ہے)

شبیر: یہ کیونکر کہہ سکتی ہو تم؟

زینت: آپ کو یہ پوچھنے کا حق حاصل ہے۔ یہ باتیں مجھے دو خطوں کے ذریعے
معلوم ہوئی ہیں۔

شبیر: دو خط؟

زینت: جی ہاں! ایک خط تو یہ رہا ـــــ آپ کی ایک پرانی کتاب میں سے نکلا ہے۔

شبیر: میری پرانی کتاب میں سے؟

زینت: آج ایک بوسیدہ ٹرنک میں سے کچھ کتابیں نکلی ہیں ـــــ انہی میں سے
یہ کتاب بھی ملی ہے۔ خیر خط سُن لو۔

(ٹوکری میں سے کتاب اٹھاتی ہے ـــ کاغذ نکالتی ہے
کھولتی ہے اور پڑھنے لگتی ہے)

سُنو:-

میرے سرتاج! میرے دل میں ایک طوفان برپا ہے،
مگر میں ضبط کر کے صرف چند لفظوں میں لکھوں گی۔ میں دنیا
میں بے آسرا بے سہارا تھی۔ تم نے مجھے سہارا دیا ـــ میں نے
اپنا سب کچھ تمہیں سمجھ لیا۔ لیکن تم مجھے چھوڑ کر سینکڑوں میل دور
جا بیٹھے ہو، میں تمہارے بھیجے ہوئے روپوں کو کیا کروں۔
ہائے تمہارے بغیر کس قدر دکھی ہوں۔ یہ میرا ہی دل جانتا ہے
خدارا آجاؤ۔ بیماری نے مجھے چلنے پھرنے سے بھی لاچار کر دیا
ہے۔ میرے لئے نہیں تو اپنے سلیم ہی کے لئے آجاؤ۔
اپنے ننھے سلیم کے لئے جو اس وقت میری گود میں لیٹا ہوا
اپنی معصوم آنکھوں سے گویا پوچھ رہا ہے۔

امی! ابا کب آئیں گے۔ بے چارے نے اب تک تمہاری
شکل نہیں دیکھی ـــــ ! میں چل بسی تو کیا ہو گا ـــ میرا دل

اس خیال ہی سے ڈوبا جاتا ہے۔ خدا کے لئے آجاؤ

آجاؤ تمہاری شائستہ!

(وقفہ)

یہ ہے پہلا خط!

شبیر: (تحریر پر جھپٹتے ہوئے) دکھاؤ مجھے۔

(زینت بجلی کی سی تیزی سے کاغذ والا ہاتھ چادر کے اندر لے جاتی ہے)

زینت: نہیں ——— تم چھین نہیں سکتے یہ۔

شبیر: میں کہتا ہوں تمہیں سخت غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ کتاب میں نے ایک مرتبہ کلکتے کے بازار میں کسی کباڑیئے کی دکان سے خریدی تھی۔ اور تم نے بیٹھے بٹھائے ایک افسانہ تراش لیا ہے۔ کیا عجیب و غریب حرکت ہے یہ آخر؟

زینت: آپ کلکتے میں بھی رہ چکے ہیں؟ آپ نے تو اس کا ذکر ہی نہیں کیا۔

شبیر: خیال نہیں رہا ہوگا ——— صرف چند روز کے لئے گیا تھا وہاں۔

زینت: یہ تحریر اس کتاب میں رکھی تھی ——— تم نے پڑھی اور پھر وہیں رکھ دیا۔ اسے ہاں ٹھیک ہے۔ تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟

شبیر: اور پھر سوچو اگر یہ تحریر جمیل کے نام ہوتی تو میرے پاس کیسے آجاتی؟

زینت: یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ دوست دوستوں سے مانگ کر کتابیں پڑھا ہی کرتے ہیں۔ تم یہ کتاب جمیل سے لائے ہو گے پڑھنے کے لئے اور پھر واپس کرنی بھول گئے ہو گے۔ اس طرح کاغذ کا یہ بے جان ٹکڑا اپنی گود میں ایک جیتی جاگتی حقیقت لئے اس کتاب کے سینے میں چھپا رہا۔ اور آج میں یونہی صفائی کی غرض سے پرانی چیزیں ہٹا رہی تھی کہ نظر آگیا۔

(وقفہ)

دوسرا خط کاغذ کا ایک بے جان ٹکڑا نہیں بلکہ بولنے چالنے والا زندہ خط ہے۔

شبیر: زندہ خط؟

زینت: وہ بچہ جس کا اس خط میں ذکر کیا گیا ہے۔

(گھور گھور کر بیوی کو دیکھتا ہے)

شبیر: کیا؟

زینت: یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ ایک باپ اپنے بچے کو ــــــ یتیم بچہ کہتا ہے ــــــ اس سے وہ اپنی نئی نویلی دلہن پر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اب تک وہ کنوارا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اپنی بیوی کے کہنے پر وہ اس مظلوم بچے کو ہوسٹل میں بھی داخل کرا دیتا ہے ــــــ ہوسٹل میں دوسرے بچے اسے چھیڑتے ہیں اور وہ گھبرا کر وہاں سے بھاگ جاتا ہے اور

(شبیر سانس روکے بیوی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا ہے)

تم میری طرف قہر آلود نظروں سے دیکھ رہے ہو۔ اگر تمہارا بس چلے تو مجھے گونگا کر دو ــــــ مگر حقیقت ہمیشہ کے لئے چھپ نہیں سکتی۔ ــــــ آج مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تمہیں اپنے دوست کا یہ جرم معلوم تھا ــــــ تمہیں ساری باتوں کی خبر تھی۔ پھر بھی تم خاموش رہے ــــــ تمہیں اپنے دوست کی دوستی اس قدر عزیز تھی کہ لڑکے کی مظلومیت بھی تمہیں متاثر نہ کر سکی۔ لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتی ــــــ ظالم کو ــــــ ظالم ہی کی حیثیت سے منظرِ عام پر آنا پڑے گا ــــــ میں ہر حالت میں بیگم جمیل کو اس کے شوہر کے سیاہ کارنامے سے آگاہ کر کے رہوں گی ــــــ میں اسے سب کچھ بتا دوں گی۔

شبیر: زینت! حد سے تجاوز نہ کرو (گرج کر) میں یہ بکواس برداشت نہیں کر سکتا۔ کبھی افسانہ تراشتی پھرتی ہو اور کبھی پاگلوں کی طرح یہ کہنے لگتی ہو کہ یہ حقیقت ہے۔ خدا را سوچ

آج تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ کیسی مضحکہ خیز باتیں کر رہی ہو۔

زینت: تمہیں معلوم ہے جب میں کسی چیز کا ارادہ کر لیتی ہوں تو عام طور پر پیچھے نہیں ہٹتی۔ اور اس معاملے میں تو پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

شبیر: دیکھوں گا تم کس طرح یہ شرم ناک اقدام کرتی ہو۔

زینت: تم اپنے دوست کے جرم کو ہمیشہ کے لئے چھپانا چاہتے ہو تو میرا گلا گھونٹ دو ——— مگر میں تمہیں یقین دلاتی ہوں یہ جرم پھر بھی ظاہر ہو کر رہے گا ایکدن۔

شبیر: تم ہو کون کسی کے معاملے میں دخل دینے والی ——— تمہیں حق آخر کیا ہے اس بات کا؟

زینت: دیکھا جائے تو کوئی حق نہیں ——— مگر سوچا جائے تو سوسائٹی کے ہر فرد کو یہ حق ہے کہ وہ سوسائٹی کے مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے میں حصہ لے۔ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو گا کہ ایک شخص اپنی بے آسرا بیوی کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور پھر دوسرا بڑا ظلم یہ کرتا ہے کہ اپنے بچے کو ——— اپنا بچہ نہیں بتاتا۔ اور اسے گھر سے نکال کر ہوسٹل میں داخل کرا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ایک یتیم بچہ ہے جس کی وہ پرورش کر رہا ہے۔

(زہر خند) پرورش!

شبیر: زینت! تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

زینت: مان لیتی ہوں یہی سہی ——— میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اور کہو۔

شبیر: میں تمہیں اس قسم کی بیہودگی نہیں کر[ ]دوں گا۔

زینت: اس معاملے میں تو[ ] اجازت نہیں لوں گی۔

شبیر: (بڑے زور سے گرج کر) زینت! انسان بنو۔ معاملے کو بہت دور تک پہنچا رہی ہو۔ اس کا نتیجہ سخت خطرناک ہو گا۔

زینت: اس کا نتیجہ کیا ہو گا ——— یہ بات فی الحال میرے ذہن سے دور ہے

اس وقت میں صرف یہ جانتی ہوں کہ مجرم کے جرم کو ظاہر کرنا اور ایک بچے کو اس کا فطری حق دلوانا میرا فرض ہے۔ فرض تمہارا ابھی ہے مگر تم میں جرأت نہیں یا کوئی اور مصلحت ہوگی شاید۔

شبیر: مصلحت؟

(شبیر زور سے بیوی کے منہ پر طمانچہ مارتا ہے۔ زینت آنکھ اٹھا کر اسے دیکھتی ہے۔ درد سے اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں)

زینت: بس! یہی آخری حربہ ہے اب تمہارے ہاتھ میرے گلے کی طرف بڑھیں گے۔ مگر میرا گلا گھونٹ دینے سے سچائی کا گلا نہیں گھونٹا جاسکتا۔ میں سچائی کا انکشاف کرکے رہوں گی — میں نے معصوم بچے کا دکھی چہرہ دیکھا ہے۔ اس کی دردانگیز باتیں سنی ہیں

شبیر: کہاں ہے بچہ؟

زینت: تمہیں اس سے کیا؟

(شبیر مغربی دروازے کی طرف جانے لگتا ہے۔ زینت جلدی سے آگے جاکر کھڑی ہوجاتی ہے)

اب چلے کہاں؟

شبیر: پیچھے ہٹو — ہٹ جاؤ۔ میں کہتا ہوں۔

زینت: بچے کو لانا چاہتے ہو، تاکہ اسے ظالم باپ اور سنگدل سوتیلی ماں کے حوالے کردو۔ تم یہ بھی کرسکتے ہو۔ وہ بچے کو پھر ہوسٹل میں بھیج دیں گے اور اس کے چاروں طرف سے دروازے بند ہوجائیں گے۔ مگر کیا تم سمجھتے ہو۔ میری زبان بھی بند ہوجائیگی۔

شبیر: (ذرا نرمی سے) میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تم ایک آباد گھر کو جہنم کیوں بنانے پر تلی ہو؟

زینت: اور میں ابھی تک یہ بات نہیں سمجھ سکی کہ تمہیں اپنے دوست کی دوستی اس قدر کیوں عزیز ہے کہ راز کے انکشاف پہ شعلے کی طرح بھڑک اٹھتے ہو۔

شبیر : دیکھو! ہمیں اس کا حق نہیں ہے۔
زینت : اور تمہارے دوست کو یہ حق تھا کہ ایک مظلوم عورت کو بیماری کی حالت میں چھوڑ کر سینکڑوں میل دور چلا جائے اور اپنے بچے کو یتیم بچہ کہہ کر کسی دوشیزہ سے شادی رچالے —— اور ——
شبیر :۔ پھر وہی بات ——
زینت :۔ کاش تم نے بچے کو اس وقت دیکھا ہوتا جب اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے —— جب وہ سہمی ہوئی معصوم نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا —— اس کی نگاہیں بے اختیار کہہ رہی تھیں۔ میں کیا کہوں —— مجھے کچھ کہنا نہیں آتا —— ہائے یہ کتنا دردناک منظر تھا —— کاش تم اس وقت یہاں ہوتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ ایک بدنصیب بچہ اپنی پرنم آنکھوں سے کتنی بڑی دردانگیز کہانی سنا سکتا ہے جس سنگدل مرد نے اس معصوم بچے پر، اس بچے کی ماں پر ستم ڈھایا ہے تم کہتے ہو اس کا جرم چھپا رہنے دو —— تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اب تک اس بچے پر کیا کچھ ہوتا رہا ہے اور آئندہ کیا ہونے والا ہے (زینت کی آواز بھرا جاتی ہے) بغیر کسی سہارے کے، بغیر کسی آسرے کے وہ کس طرح زندگی کی جدوجہد میں حصہ لے گا۔ لوگ اس کے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے۔ خدارا سوچو اگر تمہارے اپنے بچے کے ساتھ یہ سلوک ہو —— اور اسے یہ کہہ کر کسی ہوسٹل یا یتیم خانے میں داخل کرا دیا جائے کہ یہ ایک یتیم بچہ ہے —— اور بچے کو یہ احساس ہونے لگے کہ اس کا باپ —— باپ ہونے کے باوجود یتیم کہہ کر اسے گھر سے نکال رہا ہے —— تو —— میں پوچھتی ہوں تمہاری کیا کیفیت ہوگی —— تمہارے اپنے بچے کی کیا حالت ہوگی؟

شبیر : (ملائمت سے) دیکھو زینت! تمہیں معلوم نہیں دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے
زینت : ہمیں بہت کچھ معلوم نہیں مگر جو کچھ معلوم ہے اسے کیوں چھپائیں۔

شبیر: آخر تم سمجھتی کیوں نہیں ہو —— جمیل کو جب خود احساس نہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔

زینت: اسے احساس اس لئے نہیں کہ وہ سمجھتا ہے —— جو کچھ وہ کر چکا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ چھپا رہے گا۔

شبیر: میں کہتا ہوں تمہاری اس بیہودہ حرکت سے کچھ بھی نہیں ہو گا۔ بلکہ ممکن ہے حالات اور خراب ہو جائیں۔

زینت: اس کا جرم چھپ نہیں سکتا، یہ بچہ کہیں اور بھی رہ سکتا ہے۔ اگر اس میں ذرہ برابر بھی غیرت ہوگی تو وہ یہ برداشت نہیں کرے گا کہ اس کا بیٹا اس کے جیتے جی غیروں کے ٹکڑوں پر پڑا رہے۔ اس کو احساس نہ ہو —— جب بھی لوگوں کو معلوم ہو جائے گا —— اور ممکن ہے ایک دن اس کا ضمیر جاگ اٹھے۔

شبیر: زینت! تم تعلیم یافتہ عورت ہو —— تمہیں معلوم ہو گا —— ایک معمولی سی ضد پر اپنے گھر کو جہنم نہیں بنانا چاہیئے۔

زینت: یہی بات میں سمجھ نہیں سکتی۔ آخر ہمارا گھر کیوں جہنم بنے گا؟

شبیر: تمہارے ذہن میں ایک بیہودہ سی ضد جم کر رہ گئی ہے اور تم اپنے زعم میں اپنے شوہر کو شکست دینے پر تل چکی ہو۔

زینت: ہائے اللہ! تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ اس میں شکست کا کیا سوال ہے میں کیوں اس طرح سوچوں گی بھلا؟

شبیر: (نرمی سے) دیکھو زینت! ہماری زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ ہم ایک دوسرے کے سامنے شوہر اور بیوی کی حیثیت سے نہیں بلکہ دو مخالفوں کی حیثیت سے کھڑے ہیں۔ تمہارے دل میں یہ بیہودہ بات سما گئی ہے کہ اگر آج تم نے مجھے قائل نہ کر دیا تو اس میں تمہاری شکست ہوگی، اور اس خیال سے تمہارے مشتعل ذہن میں جو کچھ آتا ہے۔ بے تامل کہے چلی جاتی ہو اور یہ نہیں سمجھتیں کہ بعض اوقات ایک معمولی سی چنگاری بھی بھڑکتا ہوا شعلہ بن جاتی ہے۔ اپنی طرف سے مجھے شکست دینے پر تل چکی ہو مگر تمہاری اس ضد کا نتیجہ

کیا ہوگا ——— یہ تم نے نہیں سوچا!

زینت: تمہیں شکست دوں ——— یہ بات میرے وہم و گمان میں نہیں آئی۔

شبیر: جھوٹ مت کہو!! تم آج اسی انداز میں سوچ رہی ہو۔

زینت: ہرگز نہیں۔

شبیر: تو پھر یہ تماشا کیا ہے ——— یہ کیا ہو رہا ہے؟

زینت: یہی تو میں پوچھتی ہوں کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟

شبیر: اپنی حد سے بہت آگے بڑھ آئی ہو۔

زینت: یہ حد بندی کا مسئلہ میں نہیں جانتی۔

شبیر: تو جانتی کیا ہو؟

زینت: صرف یہ کہ ایک ظالم کو بتاؤں کہ تم نے اپنے خون، اپنے گوشت پہ کتنا بڑا ظلم کیا ہے ——— تمہاری وجہ سے ایک معصوم بچہ کس طرح برباد ہو رہا ہے۔ یہ بات میں اسے بتانا چاہتی ہوں کہ ظلم ہمیشہ پوشیدہ نہیں رہ سکتا ——— جرم سات پردوں سے بھی منظرِ عام پہ آجاتا ہے۔

شبیر: یہ سب بکواس ہے۔

زینت: کیونکہ وہ تمہارا دوست ہے۔

شبیر: دوست ہو یا نہ ہو تمہیں اس سے واسطہ؟

زینت: اگر وہ تمہارا دوست نہ ہوتا تو تم یہ رویہ اختیار نہ کرتے ——— نہ جانے کیوں تمہیں اس بات کا یقین نہیں آتا کہ تمہارا یہ دوست ایک مجرم ہے، جس کے ہاتھ ایک باپ کے نہیں ایک مجرم کے ہیں۔ کیونکہ ان ہاتھوں نے ایک بے گناہ، ایک معصوم بچے کے جائز حقوق کا گلا گھونٹ ڈالا ہے۔ ——— سچ کہتی ہوں مجھے اس شخص سے سخت نفرت ہے ——— اس کا وجود سوسائٹی کے دامن پر ایک مکروہ اور سخت بدنما داغ ہے۔

(شبیر بیوی کو گھور کر دیکھتا ہے)

مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟

شبیر :۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔

(زینت اسے حیران ہو کر دیکھتی رہتی ہے۔ منہ سے کچھ نہیں کہتی)

تم نے اس ضد میں اپنا دماغی سکون کھو دیا ہے ـــــ میں چاہتا ہوں صبر سے اس معاملے پر غور کرو۔

زینت :اس معاملے پر غور کر چکی ہوں ـــــ مگر اب اس چیز پر غور کرنا ہو گا کہ تم اپنے دوست کی حمایت میں اس قدر پاگل کیوں ہو گئے ہو؟

شبیر : (گرج کر) زینت!

(دونوں گھور کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ شبیر دروازے کی طرف جانے لگتا ہے)

میں تمہیں آخری موقع دیتا ہوں ـــــ سوچ لو

(شبیر غصّے کی شدت میں اور کچھ کہہ نہیں سکتا۔ بہ عجلت جنوبی دروازے سے نکل جاتا ہے۔ زینت وہیں کھڑی رہتی ہے اور عالمِ اضطراب میں میں اپنی پیشانی پر بار بار ہاتھ پھیرتی رہتی ہے چادر میں سے کاغذ نکالتی ہے۔ اسے تہہ کر کے اندر جیب میں رکھ لیتی ہے ـــــ کچھ دیر سوچتی ہے۔ جنوبی دروازے کے پاس جاتی ہے اور فضلاں کو آواز دیتی ہے)

فضلاں : (باہر سے) جی!

زینت :کیا کر رہی ہو؟

فضلاں : کھانا تیار کر رہی ہوں۔ ابھی ہو جائے گا۔

(زینت واپس آ کر کتاب اٹھاتی ہے اور مغربی دروازے کی طرف جانے لگتی ہے۔ دروازے کھولتی ہے اندر چلی جاتی ہے

اب سٹیج بالکل خالی ہے۔

فضلاں آتی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک برقعہ پوش عورت بھی ہے —— فضلاں جلدی سے مغربی دروازے کے اندر چلی جاتی ہے۔ چند لمحوں کے بعد فضلاں اور زینت آتی ہیں۔

زینت : (اجنبی عورت سے) آپ کون ہیں ؟

(عورت نقاب الٹ دیتی ہے۔ پچیس چھبیس برس کی ایک وجیہہ عورت ہے)

عورت : میں آپ ہی سے ملنے آئی ہوں، آپ —— مسز شبیر ——

زینت : جی فرمایئے۔

عورت : مجھے جو کچھ کہنا ہے تنہائی میں کہنا ہے۔

زینت : اچھا! —— فضلاں، جاؤ تم کھانا تیار کرو۔

(فضلاں چلی جاتی ہے)

کہیئے اب!

عورت : میں —— جمیل کی بیوی ہوں۔ پشاور سے آرہی ہوں۔ آپ نے جمیل کا نام ضرور سنا ہوگا۔ آپ کے شوہر کے دوست ہیں۔

زینت : جمیل کی بیوی ؟ آپ —— (سخت حیرت سے اسے دیکھتی ہے) تو ——

عورت : مجھے کچھ کہنا ہے آپ سے۔

زینت : آپ کو مجھ سے کچھ کہنا ہے ؟ کیا ؟ کہیئے!

عورت : جی —— بات یہ ہے —— جو کچھ میں کہنے آئی ہوں ایک سخت تلخ حقیقت ہے۔ اور مجھے بڑا افسوس ہے۔

زینت : (بے صبری سے) آپ فرمایئے نا!

عورت : جب میری جمیل صاحب سے شادی ہوئی تو گھر میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ چند روز

تو میں خاموش رہی مگر ایک دن جب لڑکے نے جمیل کو ابا کہہ کر پکارا تو میں نے جمیل سے کہا۔ آپ تو کہتے تھے میری آج تک شادی ہوئی ہی نہیں اب یہ کیا معاملہ ہے۔ انہوں نے کہا یہ لڑکا کلکتے میں پیدا ہوا تھا۔۔۔ اس کے والدین مر گئے تھے اس لئے میں اس کی پرورش کرنے لگا۔۔۔ بات ختم ہو گئی مگر جمیل صاحب محسوس کرنے لگے۔ جیسے میں لڑکے کی موجودگی پسند نہیں کرتی۔ انہوں نے پرسوں اسے ہوسٹل میں داخل کرا دیا۔ مجھے کیا پڑی تھی کہ اعتراض کرتی۔۔۔ آج معلوم ہوا کہ لڑکا ہوسٹل سے غائب ہو گیا ہے۔ جمیل کو میں نے اطلاع دی تو انہوں نے بے خیالی میں کہہ دیا۔۔۔ شبیر کے ہاں چلا گیا ہوگا۔۔۔ اس کا اصل ٹھکانا تو وہی ہے۔۔۔ میں سخت حیران ہوئی کہ آخر شبیر صاحب کا گھر لڑکے کا اصل ٹھکانا کیونکر ہوا۔۔۔ انہوں نے ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر میں پوچھتی رہی۔۔۔ آخر انہوں نے اصل حقیقت بتا دی۔

(زینت سانس روکے بڑے غور سے عورت کی طرف دیکھ رہی ہے)

زینت: اصل حقیقت؟

عورت: میں شبیر صاحب کی بڑی عزت کرتی تھی اور انہیں چچا کہہ کر پکارتی تھی۔۔۔ معلوم نہیں تھا وہ ایسے عجیب آدمی ثابت ہوں گے۔ کلکتے میں انہوں نے ایک ناچنے والی سے نکاح کیا اور پھر اسے چھوڑ کر چلے گئے اور اس وقت واپس آئے جب وہ انتظار کر کے اور ایک بچے کو جنم دے کر مر چکی تھی۔ شبیر صاحب نے یہ بچہ جمیل کے حوالے کر دیا اور وہ ہر ماہ انہیں کچھ نہ کچھ رقم دیتے رہتے۔۔۔ یہ سلسلہ اب تک جاری تھا۔۔۔ جمیل نے اپنے دوست کے جرم پر پردہ ڈال دیا۔ اور۔

زینت: (اضطراب سے اٹھ کر) مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔

عورت: مجھے سخت افسوس ہے کہ اتنی تلخ بات آپ سے کہنے کے لئے آ گئی۔۔۔ مگر یقین کیجئے جب مجھے حقیقت معلوم ہوئی تو مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔۔۔ میں نے جمیل کو سخت مجبور کر دیا اور انہیں ساتھ لے کر آ گئی۔۔۔ لڑکا شاید آپ

کے پاس ہی آیا ہے۔

زینت : ہاں ـــــ اور جمیل صاحب؟

عورت : وہ مکان کے باہر دروازے پر کھڑے ہیں ـــــ مجھے صرف یہی کہنا تھا۔

(عورت اٹھنے لگتی ہے، نقاب چہرے پر ڈالتی ہے اور دروازے کی طرف جانے لگتی ہے۔ زینت چپ چاپ وہیں کھڑی اسے دیکھ رہی ہے ـــــ یکایک قریب سے پستول چلنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ فضلاں بھاگتی ہوئی آتی ہے)

فضلاں : بی بی ـــــ صاب ـــــ کمرے میں ـــــ خون میں لت پت

زینت اور عورت : ایک ساتھ) کیا؟

فضلاں : ادھر ـــــ خون میں

(جنوبی دروازے کی طرف بھاگتی ہے۔ دونوں عورتیں تیزی سے اس کے پیچھے بھاگتی ہیں۔

(پردہ جلدی سے گرتا ہے)

دو اجنبی

کردار

مسافر............

سرائے کا منیجر............

عورت............

منظر

ایک سرائے کا کمرہ ـــــ موسم سرما کی اندھری رات

جب پردہ اٹھتا ہے تو ہم اپنے سامنے کمرے کے اندر مگر دروازے کے پاس، جو مشرقی دیوار میں ہے، مسافر اور سرائے کے منیجر کو دیکھتے ہیں۔ سرائے کے منیجر کے دائیں ہاتھ میں ایک لالٹین ہے جس کی مدھم روشنی ارد گرد کچھ دور تک پڑ رہی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوئے ہیں۔ مسافر شلوار، قمیص اور ایک پرانی وضع کی واسکٹ میں ملبوس ہے۔ جسم لانبا اور دبلا پتلا ہے۔ بائیں بغل میں تہہ کیا ہوا ایک پرانا کمبل ہے ـــــ چہرے کو دیکھ کر عمر کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ زندگی کے تلخ تجربات نے اس کی زندگی پر کافی ناخوشگوار اثر ڈالا ہے اور وہ اپنی طبعی عمر سے کافی حد تک بڑا معلوم ہوتا ہے۔ سرائے کا منیجر درمیانے قد اور ادھیڑ عمر کا آدمی ہے۔ بات ذرا تیزی سے کرتا ہے۔ آنکھوں پر عینک اور ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی ہے۔

مسافر دو تین لمحے ادھر ادھر دیکھ کر کمرے کا جائزہ لیتا ہے۔ اور کچھ آگے

بڑھتا ہے۔ منیجر وہیں کھڑا رہتا ہے)

منیجر: ہاں تو صاحب! میری سرائے میں آج صرف یہی کمرہ خالی ہے۔ آپ چاہیں تو قیام کر سکتے ہیں مگر

مسافر: مجھے صرف آج رات قیام کرنا ہے۔

منیجر: وہ تو کوئی بات نہیں، جب تک جی چاہے رہیئے۔ آپ کا اپنا گھر ہے مگر کہنا یہ چاہتا ہوں —— بلکہ یوں سمجھئے ایک بات واضح کر دوں۔

مسافر: وہی بات کہنا چاہتے ہیں جو آپ کا نوکر کہہ چکا ہے یا کچھ اور بھی ہے؟

منیجر: صاحب! ہم مسافروں سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتے۔ آخر وہ ہمارے مہربان ہیں۔ ویسے بھی اس سے سرائے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ صاف بات یہ ہے کہ اس کمرے کے متعلق لوگوں کی رائے اچھی نہیں ہے۔

مسافر: صرف اس لئے کہ یہ کمرہ سرائے سے کچھ الگ تھلگ سا ہے اور اس کے پیچھے کھنڈر ہے۔

منیجر: ممکن ہے یہی وجہ ہو —— یہ رائے اسی کے متعلق ہے۔ باقی تمام کمرے عموماً بھرے رہتے ہیں۔ کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملا۔ واقعہ یہ ہے —— صاحب! کہ ایک مرتبہ

مسافر: مجھے بھوتوں سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔

منیجر: واقعہ تو سن لیجئے!! ایک دفعہ ایک مسافر یہاں ٹھہرا تھا۔ آدھی رات کو دستک ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا —— صاحب! اس نے کیا دیکھا کہ سامنے ایک عورت کھڑی ہے —— جس کا لباس سیاہ ہے اور جس کے ایک ہاتھ میں موم بتی جل رہی ہے —— وہ مسافر چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد یہاں کوئی نہیں آیا —— بلکہ میں نے خود کسی کو یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی۔ آپ جانتے ہیں سرائے کی نیک نامی کا سوال ہے اور یہ میرا فرض ہے کہ ——

مسافر: یہ ذکر میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔

منیجر: تو ——— دیکھئے نا صاحب! ہم آپ سے کوئی بات کیوں چھپائیں؟

مسافر: آپ جانتے ہیں میں کرایہ ادا کر چکا ہوں۔

منیجر: کرایہ واپس مل سکتا ہے۔

مسافر: مگر میں ضرور ٹھہروں گا۔

منیجر: کوئی حادثہ وغیرہ ہوا تو اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔ میں بری الذمہ ہوں۔

مسافر: بہتر ——— اچھا، میں جلد سو جانا چاہتا ہوں۔ صبح چھ بجے گاڑی میں بیٹھنا ہوگا۔

منیجر: آپ کی مرضی۔ یہ لیجئے لالٹین (منیجر لالٹین مسافر کے ہاتھ میں دے دیتا ہے)

مسافر: شکریہ!

منیجر: خدا حافظ

(منیجر کمرے سے نکل جاتا ہے۔ مسافر دروازہ بند کرتا ہے، اور لالٹین کی بتی ذرا اونچی کر کے اور بلے سے اوپر اٹھا کر کمرے کا جائزہ لیتا ہے، کمرہ معمولی سا ہے۔ دیواریں سیمنٹ کی ہیں مگر ان پر جا بجا دھوئیں کے بڑے بڑے دھبے پڑے ہیں۔ سارے کمرے میں ایک ٹوٹی پھوٹی میز اور اس سے کچھ دور ایک چارپائی نظر آ رہی ہے۔ چارپائی پر سوائے تکیے کے اور کچھ بھی نہیں۔ مسافر کمبل چارپائی پر رکھ دیتا ہے اور آہستہ آہستہ چل کر میز کے پاس پہنچتا ہے۔ لالٹین وہاں رکھ دیتا ہے اور چارپائی پر بیٹھ کر دائیں ہاتھ کی انگلیاں اپنے ماتھے پر پھیلا کر سر جھکا کر سوچنے لگتا ہے۔

دور سے سٹیشن کے گھڑیال کی آواز آتی ہے جو گیارہ کا اعلان کرتی ہے۔ مسافر اٹھ کر لالٹین کی بتی ذرا اونچی کر دیتا ہے اور واپس آ کر اسی انداز میں بیٹھ جاتا ہے ——— پھر تھکاوٹ محسوس کر کے

کمبل کو تکیہ بنا کر اس طرح لیٹ جاتا ہے کہ اس کی ٹانگیں چارپائی کے نیچے لٹک رہی ہیں —— فضا خاموش ہے۔

دروازے پر آہستہ آہستہ دستک ہوتی ہے —— مسافر سر اٹھا کر ادھر دیکھتا ہے مگر اٹھتا نہیں ——————

دستک دوبارہ ہوتی ہے —— مسافر بیٹھ جاتا ہے۔ بڑے غور سے دروازے کی طرف دیکھتا ہے۔

دستک جاری ہے ——————

مسافر اٹھ کر دروازہ کھول دیتا ہے —— دروازے پر لالٹین کی مدھم روشنی میں ایک سیاہ پوش عورت کھڑی ہے قد لمبا، رنگ سفید، سینے اور بازوؤں پر بال بکھرے ہوئے۔ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں)

عورت: (تحکمانہ انداز میں) کون ہو تم؟

مسافر: (ہچکچائے بغیر) ایک مسافر!

عورت: (مسافر کو گھورتے ہوئے) تمہارا یہاں کیا کام؟

مسافر: مجھے آج کی رات یہاں قیام کرنا ہے۔

عورت: (مسافر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے) کیوں؟

مسافر: اور کوئی کمرہ خالی نہیں تھا اور مجھے یہ سرد اندھیری رات بہر صورت کہیں نہ کہیں بسر کرنی ہے۔

عورت: تمہیں معلوم نہیں تھا یہ کمرہ خالی رہتا ہے؟

مسافر: اس کی اطلاع مجھے سرائے کے منیجر نے دے دی تھی اور مجھے خبر مل گئی تھی، کہ یہ کمرہ آسیب زدہ ہے۔ اور یہاں کوئی شخص ٹھہرنے کی جرأت نہیں کرتا۔

عورت: اس کے باوجود تم یہاں ٹھہر گئے، اپنی جان کی فکر نہیں ہے تمہیں؟

مسافر: مجھے ان چیزوں سے خوف محسوس نہیں ہوتا جن سے عام لوگ ڈر جاتے ہیں۔

عورت: تمہاری پہلی گستاخی معاف کی جاتی ہے۔ فوراً چلے جاؤ۔

مسافر: شکریہ!

عورت: جاؤ ہمیں تم پر رحم آرہا ہے۔

مسافر: کاش میں آپ کے اس جذبے کی قدر کر سکتا!

عورت: (پوری طرح آنکھیں کھول کر مسافر کو گھورتے ہوئے) کیا مطلب؟

مسافر: افسوس میں اس وقت کہیں جا نہیں سکتا۔

عورت: چلے جاؤ!

مسافر: ذرا سوچئے۔ رات کافی سرد ہے۔ اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں آپ مجھے کس طرح مشورہ دے سکتی ہیں کہ فوراً یہاں سے چلا جاؤں؟

عورت: ہمیں اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

مسافر: مجبوری ہے۔

عورت: کون ہو تم؟

مسافر: عرض کر چکا ہوں۔

عورت: یہ جگہ ہمارے لئے وقف ہے۔ ہم یہاں کسی کو بھی ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

مسافر: میں ایک رات کا کرایہ ادا چکا ہوں اور صبح سے پہلے کوئی انسان یا بھوت پریت مجھے یہاں سے نکلنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔

عورت: تم ہمیں سمجھ نہیں سکے!

مسافر: اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

عورت: ہم گستاخی کی سزا دینا بھی خوب جانتے ہیں۔

مسافر: محترمہ! مجھے معلوم نہیں آپ کون ہیں۔ سچ مچ کی عورت یا کوئی روح۔ تاہم میں یہ عرض کر دوں کہ میری زندگی خوف اور دہشت سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ اگر ایسا

نہ ہوتا تو میں آپ کی شکل دیکھتے ہی چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتا۔ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ میں ذرہ برابر خوف زدہ نہیں ہوا۔ آپ بڑے شوق سے دوسرے حربے بھی استعمال کر سکتی ہیں۔

عورت: تم ——— عجیب پاگل انسان ہو۔ (عورت مسافر کو گھور گھور کر دیکھتی ہے)

مسافر: آپ نے غلط رائے قائم نہیں کی۔

عورت: فانی انسان! کسی روح کو ستانا سخت خطرناک چیز ہے۔

مسافر: (ہنستے ہوئے) خطرناک ——— میرے لئے کوئی چیز خطرناک بھی ہو سکتی ہے؟

عورت: تم اپنی بے ہودہ ضد کے نتائج سے بالکل بے خبر ہو۔

مسافر: میں زندگی کی ہر شے سے بے نیاز ہوں ——— اب زندگی کی اس منزل پر پہنچ چکا ہوں جہاں خوف اور خطرے کا کوئی احساس باقی نہیں رہتا ———

ہر حادثے کا سامنا کر سکتا ہوں حتیٰ کہ موت بھی مجھے نہیں ڈرا سکتی!

(عورت ٹکٹکی باندھ کر مسافر کو دیکھتی ہے۔ مسافر اسی شانِ بے نیازی کے ساتھ کھڑا ہے)

عورت: اس کا نتیجہ سخت بُرا ہوگا!

مسافر: ہونے دیجئے!

عورت: میں ایک بار پھر کہتی ہوں ورنہ ———

مسافر: دیکھئے محترمہ! میں پہلی اور آخری رات یہاں بسر کر رہا ہوں۔ صبح چھ بجے یہاں سے چلا جاؤں گا ——— اور ہمیشہ کے لئے چلا جاؤں گا۔ یہ کمرہ بدستور آپ کے لئے وقف رہے گا ——— آج رات یہاں ٹھہرنے کی اجازت دے دیجئے۔

عورت: تمہیں پتہ نہیں بعض مضطرب روحیں موت کی وادی سے بھی لوٹ آتی ہیں۔

مسافر: ممکن ہے ایسا ہوتا ہو ——— مگر مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ میں۔

مابعد الطبیعات کا کبھی طالب علم نہیں رہا۔

عورت: زندگی اور موت کی حدیں بہت قریب قریب ہیں۔ کبھی کبھی ایک بے چین روح موت کی سرحد میں داخل ہونے کے باوجود اپنی پہلی دنیا میں لوٹ آتی ہے اور پھر اپنے اضطراب کے ہاتھوں راتوں کی تاریکی میں اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہے۔

عام انسان یہ بھید سمجھ نہیں سکتے ـــــ وہ اس اجنبی روح کو دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔ تم ڈرتے نہیں ہو تو نہ سہی۔ لیکن ایسی بے چین روح کا احترام تو کرو!

(وقفہ)

مسافر: اس احترام کا تقاضا کیا ہے؟

عورت: یہ بات تم ابھی تک نہیں سمجھ سکے؟

مسافر: آپ چاہتی ہیں میں یہ کمرہ خالی کر کے چلا جاؤں؟

عورت: یہ رات کہیں اور بھی بسر کر سکتے ہو۔

(وقفہ: ... مسافر سر جھکا کر کچھ سوچنے لگتا ہے)

مسافر: اگر احترام کا یہی تقاضا ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔

(مسافر چارپائی کی طرف جاتا ہے، کمبل بغل میں دبا کر دروازے کا رُخ کرتا ہے)

عورت: تو تم جا رہے ہو؟

مسافر: آپ کا اصرار ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟

عورت: ذرا ٹھہرو! کیا کہا تھا تم نے ـــــ یہاں تمہاری پہلی اور آخری رات ہے۔ اس کے بعد تم ادھر کبھی نہیں آؤ گے؟

مسافر: میں یہاں سے ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں۔

عورت: وقت کیا ہوگا؟

مسافر: موت کی وادی سے لوٹ کر ـــــ آنے والی روحوں کو وقت سے کیا واسطہ؟

عورت : تم اب تک اس معاملے کو مذاق سمجھتے رہے ہو۔

مسافر : آپ کے دل کو ٹھیس لگی ہے تو معذرت پیش کرتا ہوں ——— مجھے اس کا افسوس ہے مگر میں مذاق نہیں کر رہا۔

(مسافر دروازے کے پاس پہنچ جاتا ہے)

عورت : تم چاہو تو رُک سکتے ہو۔

(مسافر رک جاتا ہے)

مسافر : فرمایئے!

عورت : کچھ نہیں۔

مسافر : آپ نے وقت پوچھا تھا ——— آدھی رات ہو چکی ہے۔

عورت : آدھی رات گذر چکی (بے تابی سے دروازے کے پاس جاکر باہر دیکھتے ہوئے) شاید گزر چکی ہے۔

(مسافر لوٹ کر چارپائی کے پاس پہنچ جاتا ہے)

مسافر : آپ کو کسی کا انتظار ہے ——— کسی اور بے تاب روح کا؟

(عورت کوئی جواب نہیں دیتی۔ دو تین لمحے خاموشی سے گزر جاتے ہیں)

عورت : تم نے کیا پوچھا تھا؟

مسافر : میں بھول گیا ہوں کہ ابھی کیا کہا تھا؟

عورت : رات کے بارہ بج چکے ہیں کیا؟

مسافر : جب میں آیا تو کلاک نے گیارہ کا اعلان کیا تھا۔ مجھے یہاں آئے ایک گھنٹہ تو بیت گیا ہوگا!

عورت : اوہ! (بدستور باہر دیکھ رہی ہے)

مسافر : آپ اتنی بے چین کیوں ہیں؟ مگر یہ سوال مجھے پوچھنا نہیں چاہیئے۔

عورت: تمہیں اس سے کیا واسطہ؟

مسافر: آپ نے درست فرمایا۔ مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیئے۔

عورت: خاموش رہو تم!

مسافر: بہتر —— مگر میں سوچتا ہوں، آپ دروازے کے پاس کھڑی ہیں۔ وہاں سردی ہوگی۔ اگر مناسب سمجھیں تو یہ (کمبل اٹھاتا ہے) کمبل اوڑھ لیں۔ یہاں اتنی سردی نہیں ہے۔

(عورت کوئی جواب نہیں دیتی۔ مسافر کمبل پکڑ کر اس کی طرف جاتا ہے اور اس کے کندھے پر رکھ کر لوٹ آتا ہے —— عورت باہر دیکھ رہی ہے۔

پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

جب پردہ دوبارہ اٹھتا ہے تو ہم اپنے سامنے وہی کمرہ اور وہی چیزیں دیکھتے ہیں جو پہلے منظر میں دیکھ چکے ہیں۔ کچھ فرق ہے تو صرف یہ کہ لالٹین کا تیل قریب قریب ختم ہو چکا ہے۔ کیونکہ روشنی بہت مدھم ہو چکی ہے —— شاید صبح کے چار بج چکے ہیں۔ روشندانوں سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آرہی ہے۔ مسافر چارپائی پر بیٹھا عورت کی طرف دیکھ رہا ہے۔ عورت دروازے کے قریب کھڑی ہے۔ کمبل کندھے پر ہے۔ چہرے کا رنگ زرد پڑ چکا ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سخت مضمحل ہو چکی ہے۔ مسافر اٹھ کر دروازے کی طرف جاتا ہے —— کلاک چار کا اعلان کرتا ہے —— مسافر اس کے پاس جا کر رک جاتا ہے۔ عورت اس کی طرف توجہ نہیں

کرتی۔ بدستور باہر دیکھ رہی ہے۔)

مسافر: چار بج گئے ـــــ کتنی بھاری ہے یہ رات، ایک ایک لمحہ زخمی سانپ کی طرح رینگ رینگ کر گزرا ہے۔ مگر آپ دروازے کے پاس کھڑی رہیں!

عورت: (اس کی طرف دیکھے بغیر) کیا؟

مسافر: اس دنیا کی مضطرب روحیں مضطرب ہی رہتی ہیں۔ جن کا انتظار کیا جاتا ہے۔ وہ اکثر نہیں آتے۔ میرا خیال ہے اس وقت آپ کو چلے جانا چاہیئے، تاکہ آپ کا بھرم بنا رہے۔

عورت: (تھکی تھکی آنکھوں سے چھت کو گھورتے ہوئے) کیوں؟

مسافر: صبح ہونے والی ہے ـــــ روشنی پھیل جائے گی۔ لوگ جاگ اٹھیں گے ـــ اور

عورت: (ایک ایک لفظ رُک رُک کر کہتے ہوئے) صبح ہونے ـ والی ہے ـــــ

مسافر: آپ کو بڑی مایوسی ہوئی۔ مگر کبھی کبھی زندگی کے دامن میں مایوسیوں کی راکھ کے سوا اور کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ چلے جانا چاہیئے اب تو آپ کو۔

عورت: کہاں؟

مسافر: کوئی نہ کوئی منزل تو ضرور ہوگی۔

عورت: کوئی نہیں! ـــــ کوئی منزل نہیں۔

مسافر: اس دنیا میں بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی کوئی منزل نہیں ہوتی جو کچھ سمجھے سوچے بغیر کسی لمبے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں جیسے دنیا کے آخری کنارے پر پہنچ کر ہی دم لیں گے۔ لیکن تمہارے ساتھ یہ قصہ نہیں ہے۔ تم جن در و دیوار کو چھوڑ کر آئی ہو ـــ وہ در و دیوار اب بھی تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ جہاں سے آئی ہو وہاں جا بھی سکتی ہو ـــــ ہر لمحہ، ہر گھڑی!

عورت: (لہجے میں سخت مایوسی) نہیں!

مسافر: مسلسل کئی گھنٹے کھڑی رہنے کی وجہ سے تھک گئی ہو۔ رنگ زرد پڑ گیا ہے۔ جانے سے پہلے کچھ دیر چارپائی پر بیٹھ کر تکان اتار لو۔

عورت: فضول!

مسافر: بڑا صدمہ پہنچا ہے تمہیں، میں جانتا ہوں۔ کاش میں کچھ کر سکتا۔

عورت: شکریہ!

مسافر: میں سوچتا ہوں کبھی کبھی زندگی کے کسی عجیب و غریب حادثے سے دو اجنبی انسان ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کی نظروں میں جھانکتے ہیں اور پھر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں ——— کسی کی منزل بہت دور ہوتی ہے اور کسی کی قریب!

عورت: (بے خیالی میں) ہوں!

مسافر: کچھ مدت کے بعد ہم بھول جائیں گے کہ ہم دونوں نے ایک رات کا کچھ حصہ دو اجنبیوں کی طرح گزارا تھا۔ تم سنہری خوابوں کا تاج محل لے کر آئی تھیں اور امیدوں کا مدفن لے کر چلی گئی تھیں اور میں ——— بیداری میں بھی کسی دور دراز جنت کا خواب دیکھتا رہا ——— کاش تم بھی

عورت: چپ رہو ——— (آواز میں بڑا دکھ) چپ رہو!

مسافر: ابھی زندگی بالکل مایوس نہیں ہو سکتی۔ اپنے زخمی ہاتھوں سے امیدوں کا دروازہ کھٹکھٹاتی رہو۔ کبھی نہ کبھی دروازہ ضرور کھل جائے گا اور پھر کسی نہ کسی امید کا ہاتھ پکڑ کر زندگی کے ویران اور تاریک راستے پر روانہ ہو جاؤ گی۔

عورت: کیسے ہو گا یہ ——— نہیں اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

مسافر: زندگی کی تاریکیوں میں جب آسمان کے ستاروں کی مشعلیں بجھ جاتی ہیں تو زمین کے ننھے ننھے جگنو جگمگا اٹھتے ہیں۔ ہمارے سارے نغموں کی تتلیاں اپنے بال و پر کھو کر خاک کے ڈھیر پر گر پڑیں۔ ہمارے سارے پھولوں کی شادابی خزاں کی زردی میں بدل جائے۔ پھر بھی ہم ایک ایسے باغ کا خواب دیکھ سکتے ہیں جو افق کے اس پار کسی جزیرے کے سینے پر آباد ہے اور جہاں ہم کبھی نہ کبھی ضرور پہنچ جائیں گے۔

(عورت فرطِ یاس سے سر دروازے سے لگا دیتی ہے)

عورت: خوش نما الفاظ —— کاغذ کے پھول —— اور کچھ نہیں —— اور کچھ بھی نہیں!

مسافر: اس قدر مایوس کیوں ہو تم؟

عورت: میرا غم بے کراں ہے۔

مسافر: غم خواہ کس قدر بے کراں ہو، امید کا ساحل کہیں نہ کہیں ضرور اُبھر آتا ہے۔

عورت: تم میرا دکھ نہیں سمجھ سکتے۔

مسافر: رخصت ہوتے وقت بھی —— دو اجنبی، اجنبی ہی رہتے ہیں۔ دلی آرزو کے باوجود وہ ایک دوسرے کے سینے میں جھانک نہیں سکتے، مگر تمہارے چہرے کی یہ اُڑی اُڑی رنگت ایک ایسی محفل کی داستان سنا رہی ہے، جہاں سب چراغوں کی آنکھیں بے نور ہو چکی ہیں —— اور جہاں کسی گلدان میں کوئی بھی شگفتہ پھول باقی نہیں رہا۔ لیکن اس وقت بھی دروازے کے باہر یوں دیکھ رہی ہو جیسے وہ ضرور آ جائے گا جس کا تم نے اتنی سردی میں دروازے کے پاس کھڑے ہو کر انتظار کیا ہے۔

یہی تو امید ہے.... یہی تو زندہ رہنے کا سہارا ہے۔

عورت: میں مایوس ہو چکی ہوں۔

مسافر: ابھی امید کی کوئی نہ کوئی چنگاری روشن ہے۔

عورت: نہیں اب کچھ بھی باقی نہیں رہا —— ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا ہے ہر طرف سناٹا چھا چکا ہے۔

مسافر: کسی نہ کسی آرزو کی مشعل جلا لو۔

عورت: مایوسی کی اس بادِ صرصر میں کون سی مشعل زندہ رہ سکتی ہے؟

مسافر: اس قدر مایوس نہیں ہونا چاہیئے تمہیں ــــ بغیر کسی سہارے کے انسان زندہ نہیں رہ سکتا! جب تمام سہارے ختم ہو جائیں تو زندگی ایک ایسی کشتی بن جاتی ہے جو چاروں طرف سے طوفانی موجوں میں گھر چکی ہو ــــ

اس لئے محترمہ ــــ

عورت: (گھبرا کر) صبح ہونے والی ہے ــــ عنقریب

مسافر: صبح ہونے والی ہے ــــ مگر اب تمہیں وہ بھرم قائم رکھنے کی ضرورت نہیں. تم سرائے کے لوگوں کو خوف زدہ کرنے والی روح نہیں ہو صرف ایک انسان ہو ــــ میں بھی ایک انسان ہوں ــــ ہم ایک دوسرے کا دکھ سکھ بانٹ نہیں سکتے. مگر ایک دوسرے کو امید کی روشنی تو دکھا سکتے ہیں ــــ سردی بڑھ گئی ہے ــــ تم نے کمبل اوڑھا کیوں نہیں؟

عورت: (کمبل پر انگلیاں پھیرتے ہوئے) یہ میرے کندھے ہی پر پڑا رہا.

مسافر: اب اوڑھ لو.

(مسافر کمبل کھول کر اس کے شانوں کے گرد پھیلا دیتا ہے.
عورت ممنونیت سے اسے دیکھتی ہے)

عورت: شکریہ! ــــ کتنے اچھے ہو تم!

مسافر: ابھی اس کا انتظار کرو گی؟

عورت: ہاں ــــ (ایک دم مایوس ہو کر) نہیں نہیں، اب فضول ہے.

مسافر: ایسی مایوسیاں زندگی میں آیا ہی کرتی ہیں. حوصلہ رکھو!

عورت: حوصلہ رکھوں ــــ حوصلہ ــــ لیکن ــــ اب ــــ کیا ہو سکتا ہے؟

مسافر: (عورت کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑے ہمدردانہ انداز میں) ــــ ایسے الفاظ مت کہو.

عورت : (اپنے خیال میں چھت کو گھورتے ہوئے) مجھے یقین تھا وہ آئے گا۔ زندگی کے اس سب سے نازک موقعے پر دھوکا نہیں دے گا۔

مسافر : ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔

عورت : (بدستور چھت کو گھورتے ہوئے) ہم دونوں نے مل کر محبت کا خواب دیکھا تھا ——— دونوں نے مل کر ایک شاندار مستقبل کا تاج محل تعمیر کیا تھا اور ———

(خاموش ہو جاتی ہے)

مسافر : کہتی جاؤ۔

عورت : (آہ بھر کر) اس کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں ——— وہ کہا کرتا تھا (آہ بھر کر ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد) ——— وہ کہا کرتا تھا ——— جب ہم پاس پاس بیٹھ کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو فضا میں قوسِ قزح کی سی رنگینیاں بکھر جاتی ہیں۔ تمہاری آنکھوں کی پُراسرار گہرائیوں میں صبح بہاریں کا اولیں اُجالا چھا جاتا ہے اور تمہاری پیشانی پر خواب ناک سایوں میں اترتی ہوئی شامِ خزاں کی سی کیفیت برس پڑتی ہے۔ تم میری امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز ہو، میری دنیا کی رونق صرف تمہارے دم سے قائم ہے۔

مسافر : کتنے خوبصورت الفاظ ہیں۔

عورت : یہی ہے سرائے کا وہ کمرہ جہاں ہم نے زندگی کے مسرور لمحے گذارے تھے۔ میں سیاہ لباس پہن کر کھنڈر کے راستے سے یہاں آجاتی تھی، پھر وہ بھی آجاتا تھا، یہاں کوئی اور آنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ یہ کمرہ آسیب زدہ سمجھا جاتا تھا۔

مسافر : میں جانتا ہوں۔

عورت : وہ قصبے کے ایک بہت بڑے رئیس کا بیٹا ہے اور میرا تعلق ایک غریب خاندان سے ہے۔ اس کا باپ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ ہم ایک دوسرے سے ملیں اور ایک دوسرے کو رفیقِ حیات بنالیں۔ اس نے ہماری راہ میں بے شمار رکاوٹیں ڈالیں۔ پھر بھی ہم محبت کی

راہ سے پیچھے نہ ہٹے۔ آج صبح اس نے اپنے بیٹے کو بلا کر صاف طور پہ کہہ دیا کہ اگر تم نے انگار کا خیال ذہن سے نہ نکالا اور میری مرضی کے مطابق شادی نہ کی تو میری جائیداد میں سے تمہیں ایک کوڑی بھی نہیں ملے گی ——— میں نے اس سے کہا دیکھو عاصم! اب تک تم میرے ساتھ رکاوٹوں کے باوجود چلتے رہے ہو۔ میں جانتی ہوں کئی بار تمہارے پاؤں پتھروں سے ٹھوکر کھا کر زخمی بھی ہوئے ہیں، مگر آج ہمارے سامنے ایک پہاڑ حائل ہو گیا ہے۔ آج بھی اگر تم نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر بڑھنے کی کوشش کی تو میں سمجھوں گی کہ میں تمہارے ساتھ ہی نہیں، تمہارے دل میں بھی ہوں۔ اگر تم باپ کی دولت ٹھکرا کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی سکت رکھتے ہو، تو میرا دل، میرا جگر مرتے دم تک تمہارے لئے وقف رہے گا اور میں ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹوں گی بتاؤ تمہارا فیصلہ کیا ہے ——— اور اس نے کہا تھا آج رات تم میرا فیصلہ سن لوگی میں آدھی رات تک ضرور تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔

مسافر: اور وہ نہیں آیا۔

عورت: (آواز میں بڑا دکھ) نہیں آیا ——— اس کی محبت میں خلوص نہیں تھا، وہ محبت کے لئے ایثار نہ کر سکا ——— باپ کی دولت نے اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں!

مسافر: تمہاری کہانی بڑی دکھ بھری ہے ——— تاہم ———

عورت: میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس طرح ساتھ چھوڑ جائے گا ——— اس طرح سارے وعدے بھول جائے گا، میری سب امیدیں پامال ہو گئیں۔ سب سہارے ٹوٹ گئے (چہرے پر ہاتھ رکھ لیتی ہے)

مسافر: نہیں۔

عورت: نہیں ———؟

مسافر: زندگی کی راکھ میں کوئی نہ کوئی چنگاری ہمیشہ رہتی ہے۔

عورت: یہ راکھ تو اب سرد ہو چکی ہے۔

مسافر: زندگی کی راکھ صرف ایک ہی مرتبہ سرد ہوتی ہے اور وہ لمحہ موت کا لمحہ ہوتا ہے جو ایک ہی بار آتا ہے اور زندگی کا سارا اثاثہ اپنے دامن میں لیکر چلا جاتا ہے۔

عورت: کیا یہ ——— موت کا لمحہ نہیں ہے؟

مسافر: نہیں ——— زندگی کی شاخوں پر امیدوں کے پھول مرجھا گئے ہیں۔ لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں۔ خزاں کا دور ختم ہوتے ہی ان ننگی شاخوں پر نئی نئی کونپلیں پھوٹ آئیں گے اور پھر ساری کی ساری شادابی لوٹ آئے گی۔

عورت: کون جانے؟

مسافر: زندگی یونہی گزرتی رہی ہے ——— آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے درمیان اور یونہی گزرتی چلی جائے گی اور پھر انگار!

(مسافر عورت کی طرف دیکھتا ہے۔ عورت چہرے سے ہاتھ ہٹالیتی ہے اور نظریں جھکالیتی ہے)

تم اس بات سے انکار نہیں کر سکتیں کہ تم نے محبت کی زندگی ضرور بسر کی ہے۔ مگر دنیا میں بعض ایسے انسان بھی موجود ہیں جنہیں محبت کی لذت کبھی ملی ہی نہیں۔ ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔

(عورت نظریں اٹھا کر مسافر کو دیکھتی ہے)

میری ویران زندگی کے سنگین دروازے سے کبھی پیار کے سپنے جھانکے ہی نہیں۔ لڑکیاں میری زندگی میں بھی آئیں مگر اس روشنی کی طرح جو ڈوبتے ہوئے سورج کے ارد گرد کچھ دیر کے لئے پھیل کر غائب ہو جاتی ہے میں تمام زندگی پیار کی مٹھاس بھری گھڑیوں کا انتظار کرتا رہا اور وقت برسات کے بادلوں کی طرح ماضی اور مستقبل کے درمیان اڑتا رہا ——— اڑتا چلا گیا، میں نے کتنے اضطراب سے چاہا کہ مجھے بھی کوئی چاہے ——— مجھے بھی جب کوئی دیکھے تو اس کی آنکھوں کے دریچوں سے پیار

کا اجالا پھوٹ نکلے ـــــ مجھ سے بھی جب کوئی بات کرے تو اس کے لفظوں میں محبت کی خوشبو ہو ــــ مگر (آہ بھر کر) زندگی محرومی کے سوا مجھے کچھ بھی نہ دے سکی ـــــ کچھ بھی نہ دے سکی ـــــ!

(مسافر خاموش ہو جاتا ہے ـــــ دروازے کی طرف دیکھتا ہے
عورت کے ہاتھ آہستہ آہستہ اٹھتے ہیں ــــ چہرے
پر پھیل جاتے ہیں اور وہ دبی دبی سسکیاں بھرنے لگتی ہے
ــــ مسافر اس کی طرف دیکھتا ہے اور اس کے شانے
پر ہاتھ رکھ دیتا ہے)

افگار!

(عورت کوئی جواب نہیں دیتی)

تم رو کیوں رہی ہو؟

(عورت بدستور خاموش ہے۔ مسافر اس کے چہرے سے ہاتھ
ہٹا کر بڑی ہمدردی سے اسے دیکھنے لگتا ہے)

اپنے آنسو پونچھ لو! افگار!

عورت: تمہارا دکھ سن کر وہ دیوار گر پڑی ہے جس نے آنسوؤں کے سیلاب کو روک رکھا تھا۔

مسافر: ایک دکھی انسان دوسرے دکھی انسان کا غم بہت جلد محسوس کر لیتا ہے۔

عورت: ہاں!

مسافر: مگر افگار! میں بھیانک سے بھیانک ناکامی میں بھی کبھی زندگی سے مایوس نہیں ہوا۔ یاس کے گہرے سے گہرے اندھیرے میں بھی امید کا کوئی نہ کوئی چراغ جھلملاتا رہا۔ تاریک سے تاریک رات میں بھی کسی نہ کسی آرزو کا جگنو پر افشاں رہا ـــــ لیکن کل مجھے یکایک احساس ہوا کہ آرزو کا آخری ستارہ بھی ڈوب گیا ہے ــــ امید کی کہیں بھی کوئی

روشنی باقی نہیں رہی۔ عین اس وقت ایک نئی تمنا جاگ اٹھی

(عورت بڑے غور سے مسافر کو دیکھ رہی ہے)

میں نے طے کر لیا کہ اب اس قصبے کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں گا ــــــ ایک نئی دنیا میں ــــــ ایک ایسی دنیا میں جو یہاں سے دور ــــــ سمندروں، دریاؤں اور پہاڑوں سے پرے افق کے دھندلکے میں ایک ننھی سی قندیل بن کر روشن ہے۔ یہیں، ان اجنبی فضاؤں میں کہیں دور سے آتے ہوئے ملاحوں کے پراسرار گیت گونج رہے ہیں ــــــ یہیں جھیلوں کے نیلے نیلے پانیوں کی گہرائیوں میں ستاروں کا آہستہ خرام کارواں چپ چاپ نہ جانے کن منزلوں کو رواں ہے۔ یہیں ہوا کے دامن میں وہ لذت انگیز خوشبو رقصاں ہے جو نہ جانے کن گل پوش وادیوں سے اُگ کر دور تک پھیل جاتی ہے۔ نیا آسمان ــــــ نئی زمین، نئے چہرے، زندگی کی نئی جد و جہد! میرے دل میں خوابوں کا ایک عجیب طوفان موجزن ہے ــــــ یہی طوفان لے کر میں شام کے وقت سٹیشن پر پہنچا تھا۔ مگر گاڑی جا چکی تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ رات کا بقیہ حصہ یہاں سرائے میں بسر کر لوں گا اور صبح کی گاڑی سے روانہ ہو جاؤں گا۔ میں یہاں آ گیا۔ پھر تم آ گئیں ــــــ پھر ہم ایک دوسرے کے قریب ہو گئے ــــــ اب آنسو پونچھ لو! بس روؤ نہیں۔

عورت: یہ میرے اختیار میں نہیں۔

مسافر: آنسو بہانے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور انسان خود کو اس پرندے کی طرح سبک محسوس کرنے لگتا ہے جو دھوپ میں اپنے گیلے پَر سکھا کر دوبارہ بلندیوں کی طرف پرواز کر جائے۔

عورت: سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔

(دو تین لمحوں کا توقف)

مسافر: کاش یہ بات میرے اختیار میں ہوتی!

عورت: کون سی بات؟

مسافر: کاش میں تمہارے دکھ کی ساری جلن اپنے سینے میں اتار لوں، تمہارے سارے آنسو اپنی آنکھوں میں جمع کر لوں، اور پھر جب جانے لگوں، جب گاڑی مجھے بلائے تو تمہارے چہرے پر زندگی کی ایک نئی تاب و توانائی ہو—— ایک نئی مسرت اور تر و تازگی ہو!

عورت: تمہارے الفاظ میں کتنی گہری ہمدردی ہے۔

مسافر: میں تو ایک اجنبی ہوں۔

عورت: ہم دونوں اجنبی ہیں۔ پھر بھی ہم نے وقت کے ان اڑتے ہوئے لمحوں میں ایک دوسرے کے ساتھ سچی ہمدردی کی ہے —ایک دوسرے کے غم کو سمجھا ہے اور

(دو تین لمحے خاموش رہنے کے بعد)

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے دکھ اور ہمارے خواب ایک دوسرے میں گھل مل سے گئے ہیں۔ تم نے بڑے خلوص سے میرا دکھ اپنانے کی کوشش کی ہے اور میں نے تمہارے خوابوں میں سے کچھ حصہ لے لیا ہے، میں دکھی ہوں مگر دکھ کے ساتھ مجھے کچھ اور بھی مل گیا ہے —— یہ ایک عجیب کیفیت ہے —— جیسے زندگی بدستور خوب صورت ہے —— یہ کائنات بہت وسیع ہے اس صبح کی ہوا میں بڑی لذت، بڑی فرحت ہے —— دنیا میں ہر انسان بہت اہم ہے

(دور سے انجن کی سیٹی)

مسافر: گاڑی آپہنچی۔

عورت: اب ہم رخصت ہو جائیں گے —— تم اپنے خواب لے کر اس فضا سے دور چلے جاؤ گے اور میں —— میں اپنا غم لے کر اسی چہار دیواری میں چلی جاؤں گی۔ جہاں سے آج رات ایک نیا خواب لے کر آئی تھی —— ——

—— لیکن میرے سینے میں ایک انجانی آرزو کا چراغ روشن ہو گیا ہے۔

—— میں یہ صدمہ برداشت کر لوں گی۔

(سیٹی کے قریب سے آواز)

پھر ہمارے درمیان کئی دریا، کئی پہاڑ حائل ہو جائیں گے —— ہم ایک دوسرے کو کبھی نہیں دیکھ سکیں گے —— ایک دوسرے کے بارے میں کبھی نہیں سن سکیں گے —— مگر یہ رات میرے دل کی گہرائیوں میں ہمیشہ زندہ رہے گی، کیونکہ اس رات کو دو اجنبیوں نے ایک دوسرے کے غم کو سمجھا ہے —— اور بے غرض ہمدردی کی ہے۔

مسافر: یہ رات میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔

عورت: تمہیں گاڑی بلا رہی ہے — جاؤ۔

(کندھے سے کمبل اٹھا کر مسافر کے کندھوں پر رکھ دیتی ہے)

مسافر: اچھا —— خدا حافظ!

عورت: خدا حافظ!

(مسافر اور عورت دو تین لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ مسافر دروازے سے نکل جاتا ہے۔ عورت انگلیوں سے آنسو خشک کرتی ہے۔ دو تین لمحے کھڑی رہتی ہے —— پھر دروازے میں گزرنے لگتی ہے

(قریب سے انجن کی سیٹی کی آواز آتی ہے —— پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔ پس منظر میں گاڑی کی چھک چھک جاری ہے)
